HINDUSTANI ACADEMY
Urdu section
Library No 373
Date of Receipt 21 10 70

انتخابات مراثی و رباعیات و قصائد و سلام و غزل وغیرہا

مرتبہ

سید آغا اشہر لکھنوی

اصح المطابع لکھنؤ

بعونہ

یہ

تالیف حقیر

محسن بخشیہ

قدردان اہلِ سخن عالیجناب مُلّی القاب نواب

بہرام الدولہ بہادر رئیس اعظم حیدرآباد دکن

کے

نام نامی سے معنون کی جاتی ہے تاکہ

باعث افتخار ہو

حقیر

مؤلف

مرحوم مولف | کسی فرد کامل کے واقعات زندگی کو جمع کر کے عوام کے سامنے پیش کرنا میری رائے میں ایک اجر معقول رکھتا ہے جس کا معاوضہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ناممکن ہے یہ ایک ایسا احسان ہے جو اُس اصل فن پر ہوتا ہے جس سے اُس فرد کو تعلق ہو۔ مثلاً اگر کسی فاضل کے حالات زندگی لکھے جائیں تو پڑھنے والے کو جابجا بحسب باتیں علم و فضل کے متعلق ملیں گی۔ اُس وقت کے فلسفہ۔ منطق۔ ریاضی۔ ادب فقہ وغیرہ کے بہتر سے بہتر جاننے والے اُس ایک فرد کی وجہ سے صفحات تالیف میں نمایاں نظر آئیں گے۔ اُس خاص دور کے لوگوں کا کسی خاص صنف علم کی طرف انہماک کا اظہار ہو جائے گا۔ اُس صنف کی تصنیفات و تالیفات کے متعلق پڑھنے والے کو اطلاع ہو جائے گی۔ حاکم وقت کی روش حکومت۔ اور اُس کے زمانہ میں جو کوششیں علوم و فنون کے برقرار رکھنے میں کی گئی ہونگی معلوم ہو جائیں گی اور پڑھنے والے سے داد طلب ہونگی

المختصر اگر کسی مقتدر فرد کے حالات زندگی اچھی طرح مرتب ہو جائیں تو پڑھنے والے

اُس کے عادات و اطوار و اخلاق و علم کا اثر ضرور پڑے گا۔ اور بعض اُس کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کی سوانح عمریاں آئندہ نسلوں کے لیے ایک قسم کی درسی کتابیں ہیں۔ خصوصاً کسی زبان کے زبردست ادیب کے حالاتِ زندگی از اول تا آخر خود ادب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کو اپنے علم ادب سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے اُتنی اُس کے غیر سے ہرگز نہیں ہوتی۔ اس علم ادب میں وہ تمام باتیں مجموعۃً ملتی ہیں جو علیحدہ علیحدہ علوم میں نظر آتی ہیں +

یورپ آج کل زبان زبان ایکا رہا ہے۔ اشاعتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ دُنیا کے چاروں کونے مغربی زبان کی تصنیفات و تالیفات سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ انسانی تمدن میں اصلاحات کے پردہ میں تغیر و تبدل ہو رہا ہے۔ روش سلطنت اور ہی رُخ چاہتی ہے +

خصوصاً ہندوستان میں انگریزی علم ادب کو تو اس قدر توسیع ہوئی ہے کہ اُس کے ادیبوں کے بیشتر نام وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو اس زبان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انگلینڈ کیا ذکر ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی میکر، عالب، ایمس کو ہرگز نہیں جانتا۔ مگر انگلینڈ میں پیدا ہونے والا ہومر، شیکسپیر، ملٹن کو ضرور جانتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ اُس کی قوم میں ایسے جوہر قابل پیدا ہوئے ہیں +

کاش ہم کو بھی زمانہ فرصت دے اور اس قابل بنائے کہ ہم بھی اپنی ٹکسالی زبان کے برقرار رکھنے میں ہم آواز ہوں! +

شاعری اور مرثیہ | زمانۂ خلیق تک فن مرثیہ گوئی محدود تھا خلیق نے اُس پر کچھ اضافہ کر کے آگے بڑھایا۔ انیس و دبیر ایسے کامل افراد نے اس آلۂ ترقی اُردو کو اس قدر توسیع دی کہ آنے والی نسلیں اُس کا صحیح استعمال بے کم و کاست کرتی رہیں تو سب کوششیں

ترقی اُردو کی ایک طرف سادہ مرثیہ گوئی ایک طرف جب نمونہ کیجیے کا اس نے سخن کو غصب پایا

اس سے قطع نظر کرکے کہ عام اہل اسلام کے لیے عموماً اور شیعہ حضرات کے لیے خصوصاً مرثیہ کا ایک حصہ (اصل واقعات کربلا) مذہبی دلچسپی رکھتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اُس کے دوسرے اجزا مثلاً بیان شجاعت، بیان عفت، بیان سخاوت، بیان عدالت یا وہ اوصاف جو ان کے تحت میں آتے ہیں، مثلاً ایثار نفس، صبر وغیرہ عام انسانوں کے لیے متحد ہیں اور سب کے جذبات اضطراری سے دائمی تعلق رکھتے ہیں لہذا دُنیا کے ہر مذہب کے افراد کے لیے مرثیہ میں یکساں دلچسپی کے سامان موجود ہیں)۔

یہی سب باتیں تھیں جنھوں نے مجھ کو رشید کے حالات زندگی لکھنے پر آمادہ کیا کہ آخر میں نے اُسے ختم ہی کر کے چھوڑا الحمد للہ والمنۃ۔

دُنیا میں یوں تو ہر شخص تعلقات اور مجبوریوں کا بندہ ہے وہ سر انسان کو زمانہ کسی خاص مصروفیت کے لیے بہت کم وقت دیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اگر ایک خوش سلیقہ طالب علم جس کو کتاب سے دائمی تعلق ہو گیا ہو، اپنے مصروف اوقات کا کچھ حصہ ادبی خدمت میں صرف کرے تو اُس کی زندگی کے وہ لمحے دلچسپی کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

جناب رشید مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے اور مجھ کو بھی اُن سے ایک خاص اُنس تھا۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۱۴ء میں میں نے عرض کی "آپ اپنے کچھ حالات قلمبند کرا دیجیے، تاکہ آپ کے بعد اُردو بولنے والوں کے سامنے پیش کر کے اُن کو آپ کی ادبی خدمتوں کا معترف کیا جائے" جواب ملا "کیا ضرورت ہے"۔ دوسری مرتبہ میں نے اس کا ذکر جناب سید باقر صاحب حمید مرحوم سے کہا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ جناب مولوی سید محمد نقی صاحب شاد مال لکھنوی سکندر فقہ مدرسہ عالیہ بارہ بنکی نے

خود جناب رشید سے ان کے حالات قلمبند کیے ہیں اور کچھ مرتب بھی کر چکے ہیں"
اب مجھ کو اس کے متعلق مزید سوال کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ یہ سن کر مسرت ہوئی کہ رشید کے
حالات ایک سنجیدہ قلم سے شائع ہونگے۔

جناب رشید کے انتقال کے بعد ایک روز پھر میں نے جناب حمید مرحوم
سے عرض کی "ابھی تک کوئی تالیف رشید کے متعلق شائع نہیں ہوئی" مرحوم نے
فرمایا "نہ امید ہے" میں نے عرض کی "اگر میں کوشش کروں تو آپ مدد دینگے" فرمایا "
بسر و چشم لیکن اگر مولوی محمد اتقی صاحب شاداں سے وہ مکمل حالات مل سکیں
جو انھوں نے اس غرض سے فراہم کیے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا" میں نے کہا۔ بہت خوب"
چنانچہ ۱۹۱۷ء میں صرف اس غرض سے میں رامپور گیا اور مولوی صاحب موصوف سے
خواہش کی کہ وہ مجھے حالات جناب رشید دے دیں۔ انھوں نے مجھ کو اپنا نیاز مند
فاہم سمجھ کے وہ تمام ذخیرہ جو ان کے پاس موجود تھا میرے حوالہ کیا۔ جو اس تالیف کے
مندرجہ ذیل حصوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے

(۱) جناب انس کے حالات قریب قریب مرتب

(۲) رشید کے حالات غیر مرتب (یعنی صرف ان کے مرثیہ پڑھنے کے مقامات کا مختصر حال)
باقی تمام حالات ضروری بڑی کوشش سے خود فراہم کیے جو اس ترتیبی صورت میں موقر
ناظرین کے سامنے پیش ہیں۔

جناب رشید کے حالات زندگی اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ مرحوم
نے اپنی تمام عمر گوشۂ عافیت میں گذار دی۔ دوسرے مرثیہ گوئی کا اہم کام ان کے ذمہ
ایسا تھا کہ ان کو کنج عزلت سے نکلنے سے روکتا تھا

میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی اور جناب عزیز کاظم حسین صاحب
محشر کا ممنون ہوں۔ ان دونوں حضرات نے مجھ کو مختلف واقعات رشید دیے۔ اور
وقتاً فوقتاً میری ہمت افزائی کرتے رہے تاکہ میں جلد سے جلد اس تالیف کو ختم کروں۔ جناب
نواب مجنّن صاحب جوہر۔ اور جناب بدھن صاحب فرہاد لکھنوی کا ممنون ہوں
ان حضرات نے مجھ کو فراہمی کلام رشید میں مدد دی ہے۔ جناب مولوی سید احمد حسن صاحب
ہاتف وکیل۔ اور جناب منشی علی محمد صاحب نظم سیتاپوری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں
اول الذکر کے مشورہ ہائے صائب سے مستفید ہوا ہوں اور آخر الذکر کے ذخیرہ کتب سے
اکثر مدد ملی ہے۔ آخر میں معظمی جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی
پروفیسر مدرسہ عالیہ ریاست رامپور کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ موصوف نے اس
مسودہ کو سن کے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور بیش بہا مشورے دیے ہیں۔

ناظرین کی خدمت میں ایک مختصر عرض اور کرنا چاہتا ہوں۔ اور عبارت کو ختم
کرتا ہوں وہ یہ کہ علاوہ اصل واقعات کے اگر کوئی رائے غیر صائب ہو۔ یا کوئی بحث
کسی صاحب کو پسند نہ آئے تو وہ میرے قلم کی کوتاہی ہے جس کا میں ہر وقت معترف ہوں
اور رہوں گا۔

احقر
سید آغا اشہر لکھنوی

اس بنا پر باطنی نظارہ کرنے والا کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کا اشتیاق اپنے مطمح نظر صورت کی تلاش میں کوئی مستقل حد قائم نہیں کر سکتا بلکہ ہر لمحہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہاں اگر خیال اور اضطرار کی کوئی حد معین ہوتی تو میں ہر کہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تصویرِ قلم سے زیادہ تصویرِ خیال دلچسپ ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ شاعری اور مصوری ایک ہی درخت (خیال) کی دو بار آور شاخیں ہیں لیکن شاخِ مصوری شاعری کی گھنی شاخ کے سایہ میں جھونکے لے لے کے دلفریبیاں دکھاتی ہے کیونکہ مصور بھی پہلے شاعرانہ قوت سے کام لیتا ہے اُس کے بعد اندازہ سے اور پھر قلم سے اس وقت آپ کے سامنے میں نے دو تصویریں پیش کیں۔

۱۔ تصویرِ قلم ۲۔ تصویرِ خیال

تصویرِ قلم کی تکمیل کے لیے ان چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔

۱۔ مصور کا صحیح اندازہ۔ ۲۔ حسبِ منشا قلم پر قدرت۔

۳۔ مناسبت اجزائے تصویر۔ ۴۔ سامان۔ رنگ وغیرہ۔

وہی قلم کار کامیاب سمجھا جاتا ہے جس کو یہ سب آسانیاں نصیب ہوں۔ اُسی طرح قسمت کے بنائے ہوئے نمونے اس نظر خوش کن تجارت کے بازار کو گرم رکھتے ہیں۔ گو اُس سے کم مرتبہ والے بھی ہمیشہ شہرت کے زینہ پر اُس کے برابر آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں فطرت کا دخل ہوتا ہے وہاں کوشش و کسب بے سود۔

افسوس ہے کہ اس فن کی قدر ہندوستان میں ابھی بالکل نہیں ورنہ اس کی ترقی کے ساتھ شاعرانہ ترقی بھی جاری رہتی۔

اسی طرح ایک تصویرِ خیالی کے لیے مندرجۂ ذیل چیزوں کی ضرورت ہے۔ جن کا کل

علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی

۱۔ صحتِ خیال ۲۔ قدرتِ اظہار

۳۔ مناسبتِ الفاظ ۴۔ اطلاعِ فن

یہ سب خوبیاں اگر کسی شاعر میں پائی جائیں تو بے شک وہ اک فطرتی شاعر ہے۔ مگر تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس معدوم ہو جانے والے گروہ کے آخری دور تک ایسے کاملین کے کم نام جمع ہو سکیں گے۔

قوتِ خیال | یہی صحتِ خیال (بعض اوقات) شاعر کو اُن امور کا پتہ دیتی ہے جو عالمِ وجود میں ابھی نہ آئے ہوں۔ یہی قوت شاعر اور پیشین گو کو ایک ہی درجہ پر لے آتی ہے۔ شاعر کا ذریعۂ اطلاع اُس کا ذہن رسا، اور فکرِ صائب ہے برخلاف اس کے ایک پیشین گو کا ذریعۂ اطلاع اُس کا تزکیۂ نفس، اور صفائی باطن ہوتی ہے۔ اور دونوں میں یہی فرق ہے جس کی وجہ سے ایک ایسے شاعر کو جو قوتِ استنباط رکھتا ہو زیادہ سری نظر سے دیکھتی ہے۔ اور ایک پیشین گو کو دوسری نظر سے۔ اس موقع پر بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آگیا ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ بظاہر ان دونوں کا ذہن عمل ایک دوسرے سے جدا نظر آتا ہے۔ مگر غرض دونوں کے خلق کی ایک ہی ہے۔ شاہ نعمت اللہ کے قصائد کی نسبت مشہور ہے کہ اُن میں تمام آئندہ کے حالات بالاجمال لکھ دیئے گئے ہیں۔ اب آپ کی پسند پر ہے چاہے انھیں پیشین گو کا لقب دیجیے یا شاعر کا۔

قوتِ اظہار | صحتِ خیال کے بعد قوتِ اظہار کی باری آتی ہے۔ یہ قوت بھی شاعر کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے مذکورۂ بالا قوت یعنی (صحتِ خیال) اس کے بغیر شاعر کا کوئی خیال صحیح صحیح عالمِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اُس کی تمام فکریں رائگاں۔ اُس کے تمام منصوبے

بے سود۔ اگر یہ قوت نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن جہاں یہ قوتیں برابر برابر کام کرتی ہیں وہاں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ اور ان کا کہنے والا جس وقع نام سے پکارا جائے زیبا ہے۔

متقدمین شعرائے عجم میں فردوسی، اور متاخرین میں قاآنی ہے۔ اُردو میں سودا اور انیس ہیں۔ جن میں قوت اظہار درجۂ کمال پر پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دوسرے نام بھی اسی سلسلہ میں لکھے جا سکتے ہیں مگر یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ہر ناظر کو اختیار ہے کہ اپنی رائے کے موافق دوسرے نام بڑھا لے۔

مناسب الفاظ اظہار خیالات و جذبات کا قدرتی آلہ جو انسان کو فطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے وہ اُس کی مادری زبان ہے۔ ہم اپنی زبان کے اصطلاحات و محاورات پر قادر ہونگے اُسی قدر ہماری شاعرانہ خوبیوں کو اظہار کا موقع ملے گا۔ یا یہ کہنا درست ہوگا کہ جس کو جس قدر ملکہ اس خزانہ کے صرف کرنے کا حاصل ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی خیالی تصویر جواہر نگار نظر آئے گی۔

اسی مناسبت الفاظ کو مانند مرصع کاری کہتا ہے۔ اسی کو فن کاری۔ یہی سخن طرازی ہے یہی دل آویزی۔ علاوہ یہ کہ یہی سب کچھ ہے۔

اس قوت کے جوہر اُسی وقت کھلتے ہیں جب کسی مقرر کو ریزہ سا ایک گنجائش آبادی مجمع کو مخاطب کرنا ہو۔ کسی مضمون کو مختلف رنگوں سے سمجھانا ہو۔ یا ان کے جذبات طرب یا جذبات الم کو برانگیختہ کرنا ہو۔ یا کسی واقعہ کو مسلسل بیان کرنا ہو تو بغیر مناسبت الفاظ سامعین خاطر خواہ متوجہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ایک مصنف یا مؤلف کو جب تک مناسب تحریر کی قدرت نہ ہو اُس وقت تک صرف کاغذ کا سیاہ کرنا ہے۔

ایک معنوی شاعر کی شناخت یہ ہے کہ اُس کی نظم میں خیالات و مناسبات الفاظ

دوسرے دگر بیان نظر آتے ہیں۔ وہی شعر سہل ممتنع کہلانے کے قابل ہے جس میں صنعتِ جمال کی خوبی اپنی حد تک پہنچ چکی ہو۔ اور مناسبت الفاظ کی کسوٹی پر کس لیا گیا ہو۔

یہی صنعت شاعر کو پختہ کار بناتی ہے یہی قادر الکلام کہلواتی ہے۔ یہی فردوسی کو فردوسی قاآنی کو قاآنی سودا کو سودا اور انیس کو انیس بناتی ہے۔

کسی واقعہ یا مضمون کو نظم کر دینا کوئی مشکل امر نہیں مگر اس کو دلچسپ بنانا مشکل ہے ہزاروں شاعر پیدا ہوتے ہیں مگر ایک صدی دوسری صدی کو جو شعرا کی فہرست دیتی ہے اس میں مشکل سے چار پانچ نام ہوتے ہیں۔ اور بس۔

اس وقت اردو شاعری کا سفینہ کھینے والے ہندوستان میں ہر طرف نظر آتے ہیں مگر زمانہ کی بے رخ لہر خود انھیں کو ادھر سے اُدھر تھپیڑے دیتی ہے کہ سنبھلنا مشکل ہے ساحل مراد پر پہنچنے کا لیا ذکر۔ بہر حال یہ بھی ایک قسم کا احسان ہے جس سے جس طرح بن پڑے کوشش کرے۔ کسی وقت تو کامیابی کی دیرنما صورت نظر آئے گی۔

اطلاع فن اطلاع فن کے متعلق یہ عرض ہے کہ سب سے پہلی ضروری چیز یہی ہے۔ اور سب سے آخر بھی۔ اور نہیں بھی۔ مگر شاعر کو نہایت ضروری ہے کہ مشقِ سخن سے پہلے فنِ شعر کے ابتدائی مسائل سے واقفیت حاصل کرے ورنہ بغیر اس کے خود اس کی طبیعت کو اطمینان کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ذوق، ناسخ کی طرح نہ سہی تو انیس و آتش ہی کی طرح سہی گو چودھویں صدی کی شاعرانہ طوائف الملوکی نے فن کا سد باب کر دیا ہے مگر جو خال خال فن داں واقف فن اس وقت نظر آتے ہیں ان کے بعد اتنے بھی نہ ہونگے۔

بس میرا تنگ میدان قلم جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب یہ آخری صدا دے کے ختم کرتا ہے کہ

"اے نوجوانو! ہند کی خاک کو کیمیا بناؤ۔ اور اپنی مادری زبان کو سنوارو۔"

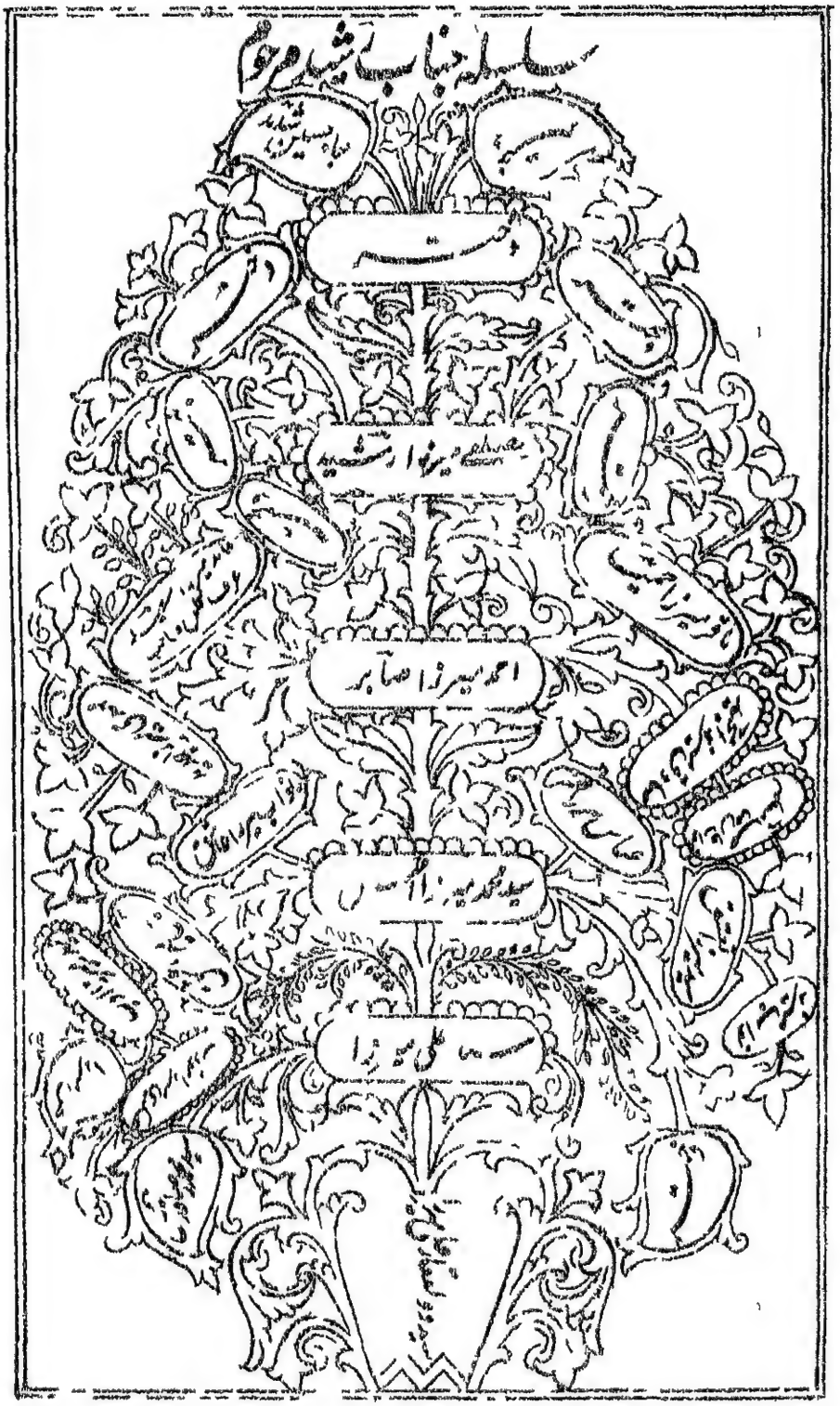
سلسلهٔ جناب رشید مرحوم
احمد میرزا صابر

سید ذوالفقار علی میرزا

یہ بزرگ غالباً زمانہ محمد شاہ میں کشمیر سے دہلی آئے اور کسی وزیر کے نائب ہوئے اور خطاب میرزا حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اولاد و احفاد کے نام کے ساتھ لفظ میرزا ضرور ہوتی ہے۔ بعد اس کے سید ذوالفقار علی میرزا دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہاں آکر سکونت اختیار کی

لفظ میرزا کی تحقیق

اس لفظ کے متعلق جہاں تک تحقیق ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ میرزا کا جزو نام ہونا علامت سیادت کی نہیں۔ اگرچہ ایران میں یہ لفظ اطلاق سیادت کرتی ہے۔ مگر ہندوستان میں اس خصوصیت کے لیے مروج نہیں چنانچہ صاحب بہار عجم لکھتے ہیں

"میرزا بیائے معروف ایں لفظ بیشتر از القاب پادشاہاں و شاہزادگان بود دریں روزگار بر بزرگ زادگان و رئیس پسراں اطلاق کنند۔ در ایران بر سادات نیز مجوز است۔ غالباً میر مخفف امیر است پس معنی ترکیبی میرزا امیرزادہ باشد۔ از زمانے کہ نادر شاہ در ہندوستان در آمد و در قبض و تصرف آورد۔ اطلاق میرزایاں بر عہدہ ران دفتر شاہی کنند کہ میرزائے دفتر عبارت از نویسندہ دفتر خانہ پادشاہی ست"

مؤلف کے نزدیک چونکہ میر اصطلاحاً بمعنی سردار ہے جیسے میر آتش، میر سامان، میر بحر وغیرہ اسی طرح میرزا سے ملازمین دفتر شاہی کی آتو بعظمت ظاہر ہوتی ہے۔

بہرحال سید ذوالفقار علی میرزا مع اپنے فرزند سید علی میرزا صاحب کے لکھنؤ آکر مقیم ہوئے۔ ان بزرگ نے دہلی کیوں ترک کی۔ اور لکھنؤ کیوں آئے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ زوال سلطنت مغلیہ کے ہمراہ اہل قلم کا ستارہ بھی پستی کی طرف مائل ہونے لگا زمانہ نے ایسے ایسے نازک مزاج اور مستغنی دلوں کو حوادث کا نشانہ بنایا جو کبھی سوائے آسمان کے

زمین کی طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ کونسی مثال دی جائے کس کا نام لکھا جائے۔ اُس وقت کے ناموروں کے تذکروں کا ہر ہر ورق ایک نئی مثال پیش کرنے کو تیار ہے۔ بہت ٹھیک خیال ہے کہ دہلی اُجڑی۔ اور لکھنؤ آباد ہوا۔

امرائے لکھنؤ کی اولوالعزمیاں حد اعتدال سے متجاوز ہو چکی تھیں۔ دہلی کے ضعف کا کوئی خاص اثر لکھنؤ پر نہ تھا۔ علوم قدیمہ کا وقار دلوں میں باقی تھا۔ خصوصاً فنِ شعر جس کا عالمگیر اثر اس ناداری کے زمانہ میں بھی بہت سے دلوں پر قادر ہے۔ اُس وقت کے رؤسا کے درباروں کا ایک گلدستۂ زینت تھا۔ جس نے دہلی کو الوداع کہا وہ لکھنؤ یا حیدرآباد جا بسا +

افسوس ہے کہ میر صاحب کے مزید حالات نہ مل سکے۔ جو درج کیے جاتے۔ خود جنابِ رشید مرحوم سے جیسا معلوم ہو سکا تھا۔ وہ لکھا گیا۔ کیونکہ کسی تاریخ کی کتاب میں اُن کے خاندان اور کسب معاش کے متعلق کچھ نہ ملا + البتہ آغا میر کا ذکر ملتا ہے۔ صاحبِ تاریخ اودھ عبارتِ ذیل لکھتے ہیں جس سے عالی نسبی اور سیادت کی شہادت ملتی ہے

"ازاں جملہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کی علوئے نسب پدری و شرافت و سیادت۔ و حُسن لیاقت اور مروّت خاص۔ اور سیر چشمی و رفقا پروری بہت غنیمت تھی"

(معتمد الدولہ آغا میر سید ذوالفقار علی کے بھتیجے تھے)

سید علی میرزا

یہ ذوالفقار علی میرزا کے فرزند تھے۔ شاہِ اودھ (غازی الدین حیدر) کے زمانہ میں کارسفارت انجام دیتے تھے۔ بنارس میں ان کا زیادہ قیام رہتا تھا۔ نہایت خوب صورت اور وجیہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بنارس میں نکلتے تھے تو لوگ اُن کی صورت دیکھکر درود پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں جس قدر منڈیاں تھیں۔ اُن کی تحصیل وصول بھی انھیں کے متعلق تھی۔ معتمد الدولہ آغا میر مشہور وزیرِ اودھ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ بھائیوں میں چشمک رہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آغا میر کو عروجِ تام حاصل ہوا۔ ان کی تنخواہ بند کرادی۔ شاہ مینا صاحب کے وہاں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ تخمیناً ستر برس کی عمر ہوئی اور غالباً حسن رضا خاں کے امام باڑہ میں مدفون ہیں۔

سید صاحب کے دو بیٹے تھے۔ سید محمد میرزا اُنس۔ سید محمد رضا قدس۔

علی میرزا صاحب مغفور کو خطِ نسخ میں یدِ طولےٰ حاصل تھا۔ اور اُس وقت کے بہتر نسخ لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پورا سورۂ یٰسین لکھ کر حضورِ شاہی میں پیش کیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ صلہ ملا۔ رشید مرحوم کے پاس اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف موجود تھا۔

سید محمد میرزا صاحب انس

سید ذوالفقار علی کے پوتے اور جناب رشید کے دادا تھے ان کا تخلص (انس) تھا۔ حضرت ناسخ مرحوم کے شاگرد تھے اس خاندان میں انہیں سے شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ تذکرۂ آب حیات میں آزاد مرحوم نے شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں لکھا۔ ظاہرا وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ دوسرے آزاد مرحوم نے شاگردان ناسخ کے لیے زیادہ کاوش بھی نہیں کی ہے۔ البتہ عبدالغفور خاں شہباز نے اپنے تذکرہ میں سلسلۂ ناسخ میں اُنس کا ذکر کیا ہے۔

جناب اُنس ذی علم مرنج تھے۔ عربی کے تمام درسیات نکلے ہوئے تھے۔ اور فارسی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ دیوان قلمی اس وقت تک خاندان رشید میں موجود ہے۔ جناب رشید سے جب کہا گیا "دیوان طبع کرا دیجیے" فرمایا "اُن کی وصیت تھی کہ چھپوانا نہیں"

حلیہ و لباس گورا رنگ تھا۔ نہایت خوب صورت تھے۔ جوانی میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ کیا وہ (جو مثل کمان کے ہوتا ہے) کھینچتے تھے۔ اونچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اور جس وقت دربار میں جاتے تھے تو چپکن استعمال کرتے تھے۔ کرتہ بہت نیچا ہوتا تھا۔ کبھی مشروع کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اور کبھی سادہ۔ ٹوپی پنجگوشیہ قالب دار۔ جوتہ گھیتلا وہی ایک اشرفی کا۔ مگر کبھی کبھی لوٹ بھی +

نزلی سکونت شاہی زمانہ میں بہت سے محلوں میں رہے مثلاً مشک گنج رشیدیوں والا احاطہ غدر کے بعد حسن خاں خواص واجد علی شاہ کا مکان ایک ہزار ایک سو روپیہ کو خرید کیا

اُس کے برابر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا وہ بھی خریدا۔ اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے مکان بنوائے جو اب تک "میر عشق کی بغیچہ" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر میر صاحب کے زمانہ میں "باغِ اُنس" کہلاتا تھا +

میر صاحب نے چاہا تھا کہ اس باغ کے متصل ایک امام باڑہ بنائیں۔ لیکن ایک پھاٹک اور اُس کے اوپر دو کمرے بن کر رہ گئے۔ جو اب تک موجود ہیں اس امام باڑہ کے مقدس تہہ خانہ میں سہرہ رازِ نظم کے چند ہاؤ و ہو بیان بلبل خواب گراں میں مصروف ہیں اب وہ وقت ہے کہ خود اُنھیں کے ہاتھوں کے پروش یافتہ درختوں کے پھول نسیم سحر کو اپنی مہک سے عطر بیز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کبھی پھر ہماری طرف توجہ کریں۔ مگر وہ سر جھونکے اُن کے خواب کی مدت اور طولانی کرتے ہوئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے واپس آتے ہیں

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی　　تمھیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہے

یہاں اُنس، صابر، تعشق، عاشق، حدید کی قبریں ہیں۔ (میر عشق کی قبر یہاں نہیں ہے بلکہ اُس مکان میں ہے جہاں رشید مرحوم رہتے تھے۔ وہ مکان بھی باغ سے متصل ہے +

اُنس اور مشاعرے

اُن کی غزل خوانی کا بہت شہرہ تھا۔ سراج الدولہ، اسیر وغیرہم کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعرے کو اپنا شاخواں بنا کے اُٹھتے تھے۔ آخر وقت میں جب نواب مہدی حسن خاں عرف آغا صاحب سی۔ آئی۔ ای متولی حسین آباد مبارک کا شباب تھا۔ تو اُن کو بھی بمقتضائے عمر شعر گوئی کا شوق ہوا۔ کئی دفعہ خود اُنس مغفور کے پاس آئے۔ اور اپنے مشاعرے کی شرکت کی استدعا کی۔ میر صاحب نے پیرانہ سالی کا عذر کیا۔ مگر آغا صاحب اس قدر حسنِ عقیدت رکھتے تھے کہ نہ مانا۔ مجبوراً میر صاحب چند مشاعروں میں شریک ہوئے +

اوارگی سب | میر صاحب کے یہاں ہر اتوار کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی۔ شہر کے اکثر نامی شعرا اور رؤسا اور اہل اسلام ادا کیا کرتے تھے مثلاً سلق۔ تجر۔ امیر میر کلو عرش۔ مخدومی مناد صفی صاحب کے والد ا ر مولانا فضل علی صاحب مرحوم۔ تعشق۔ عشق۔ صابر۔ اچھے صاحب علیق ان لوگوں سے تو گویا اتوار ماقہ ہی نہ ہوتا تھا۔ حکیم شفاء الدولہ مرحوم کے بھائی میاں فلک مرحوم صرف شرکت صحبت کی غرض سے لکھنؤ اکثر آیا کرتے تھے (اللہ اکبر ایک وہ زمانہ تھا اور ایک ہمارا زمانہ ہے کہ شعر و سخن کے ذکر سے گویا کہ اُس وقت کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہوتے) چاند بسکٹ۔ شامی کباب۔ روغنی روٹیاں۔ تواضع میں پیشکش کی جاتی تھیں۔

اس صحبت میں ہر قسم کے ذکر اذکار ہوتے تھے۔ کبھی شاہی زمانہ کے قصے چھڑ گئے کبھی شاعری پر بحث ہونے لگی۔ کبھی لغوی تحقیقات ہونے لگی۔ اور کبھی شعر خوانی۔

جناب رشید دمیا فرماتے تھے۔ کہ دادا صاحب (جناب اُنس) شیخ ناسخ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے اور عجیب عجیب دلچسپ حکایات بیان کرتے تھے۔ مثلاً۔

نقل

ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خدمت میں غزل لے کر ٹکسال والے مکان میں حاضر ہوا۔ ڈیوڑھی کے دروازہ میں قدم رکھتا دیکھتا کیا ہوں کہ موری بند کرا دی ہے تمام انگنائی میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اور بیچ صحن میں خود بدولت چوکی بچھائے بیٹھے ہیں مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن اُن کے خوف سے فوراً ضبط کیا۔ جب میری طرف دیکھا میں نے سلام کیا۔ کہا آؤ۔ اُن کے اس فرمانے پر قریب تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑوں۔ لیکن بمشکل ضبط کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کیونکر آؤں۔ چاروں طرف تو پانی

بھرا ہوا ہے۔ فرمایا ہاں۔ پھر آدمی کو پکارا صلابت اصلابت! وہ آیا تو اُس سے کہا
یہ سُرا لاؤ وہ ایک لمبا سا پٹرا لایا وہ رکھا گیا۔ اور میں اُس کے ذریعہ سے چوکی پر پہنچا۔
اُس شیخ صاحب نے فرمایا: اُس تم نے مجھے یہ بات کیا کیا؟ میں نے عرض کیا یہ
جی نہیں" فرمایا: "آتے تو چوک کی سیر کو ہیں جب وہاں سے بھی پھر گیا تو کہتے ہیں چلو
ناسخ کے شعر سنیں۔ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے ہیں کیجحت دماغ پریشاں کرتے ہیں۔ یہ ترکیب
میں نے اُنھیں لوگوں کے لیے کی ہے۔ اب کہو کر میرے پاس آئیں گے۔ یہ کہہ کر
پٹرا ہٹوا دیا۔

جناب اُنس نے یہ نقل بیان کی لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ مارے ہنسی کے
لوٹے جاتے تھے۔

چونکہ اس صحبت کے سلسلہ میں میر کلو عرش کا ذکر بھی آگیا ہے۔ لہذا اُن کا بھی
مختصر ذکر کر دینا فرض سمجھتا ہوں۔ کسی تذکرہ نویس نے میر کلو عرش کے مدفن کا نشان
نہیں دیا ہے۔ یہ امر اتفاقی ہے کہ رشید نے اس صحبت کے سلسلہ میں اُن کی قبر کی
طرف اشارہ کر کے کہا کہ عرش کی قبر اس امام باڑہ کے صحن میں ہے۔

میر کلو عرش | میر کلو عرش خلف ناخدا لئے سخن میر مرحوم گو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کی
خوش گوئی زبان زد عوام تھی۔ جناب اُنس سے قدیمانہ مراسم تھے۔ اور کوئی ذاتی آمدنی بھی
اس وجہ سے میر صاحب ہی کے پاس رہتے تھے۔ میر اُنس صاحب کی وضع داری اور
فراخ دلی نے عرش مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلو عرش ایسا
سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت سے گذار سکتا تھا
ہاں یہ لطفِ شعر گوئی اور صحبت اہل علم اُن کو اور کسی جگہ میسر نہیں ہو سکتی تھی پرانے لوگ تھے

زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر موجودہ طرزِ تمدن کی طرف نظر ڈالو تو اس کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

حلیہ | میر کلو عرش کی رنگت سانولی کشیدہ قامت تھے۔ اوسط کا جسم تھا۔ سر پر پٹہ تھے اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ گھیتلا جوتا۔ یا بوٹ پہنتے تھے۔ آخر عمر میں بسبب پیرانہ سالی کمر خم ہوگئی تھی۔ اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت آنکھیں بند رہتی تھیں حقہ سامنے لگا رہتا تھا۔ جناب رشید جناب حمید اکثر ان سے مذاق کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے سامنے حقہ سے چلم اتار کے دوسرے حقہ پر رکھدی اور غائب ہوگئے۔ انھوں نے تھوڑے سے مراقبہ کے بعد بہ کشف یا اندازہ معلوم ہوا کہ بغیر چلم کا حقہ بول رہا ہے۔ اب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چلم ندارد ہے۔ صرف یہ کہہ کے اٹھ گئے کہ "یہ لڑکے بڑے شریر ہیں"۔ وضع داری کی اس قدر پابندی کی کہ انتقال بھی یہیں ہوا اور دفن بھی یہیں ہوئے۔ میر محمد جان صاحب شاد انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

ایک صاحب شاہ مرحوم کی زبانی ناقل ہیں کہ میر کلو عرش نے وضع میں دخل کرلیا تھا کہ پانچ بجے قریب شاہ تحسین کی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے اور جاروب کش نظیر اُنے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے کسی رئیس کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھتے تھے۔ یہ وہی تحسین کی مسجد ہے جہاں میر کلو عرش کا نازک مزاج باپ میر تقی میر فاقہ مستی کی حالت میں ایک دفعہ بیٹھا ہوا تھا کہ سعادت علی خاں بہادر کی سواری سامنے سے نمودار ہوئی "نگاہ رو برو" کی صدائیں بلند ہوکر بڑے بڑے رؤسا کا سر تسلیم خم کرتی جاتی تھیں۔ مگر اس بادشاہِ سخن پر شوکتِ شاہی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حتیٰ کہ سلام تک نہیں کیا۔ سعادت علی خاں بہادر کو نہایت ناگوار ہوا۔ اور انشا سے جو اس وقت

ہم رکاب تھے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ انھوں نے عرض کیا۔ کہ یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر اکثر حضور میں آیا کرتا ہے۔ اور شاید اس وقت بھی فقرہ سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے ہوا خوری سے واپس آکے ایک ہزار روپیہ اور خلعت میر صاحب کو بھیجا جسے انھوں نے بہزار دقت منظور کیا۔" (ماخوذ از آب حیات)

عرش کی نظر اسعا پیوند زدہ انگرکھے کو قبائے زربفت سے بہتر سمجھتی تھی۔ آخر میر ہی کے تو بیٹے تھے۔ ذیل کے دو شعر رشید مرحوم کی زبانی سنے گئے تھے۔ دیوان میں موجود نہیں۔

مدت ہوئی نہیں خبر رفتگاں مجھے — یوسف وہ ہوں کہ چھوڑ گیا کارواں مجھے
لے یار کو دیں بھی نہیں ایک کا فرا — لے جائے گی یہ وحشت دل اکبار مجھے

اب میں میر انیس کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ اور ان کے واقعات عمر خلاصہ بیان کرتا ہوں

انیس اور معاشرت

زمانۂ شاہی میں آپ کا نام بجرائیوں میں تھا اور سو روپیہ تنخواہ ماہوار کی سرکار سے ملتے تھے لیکن ان کو بھی دربار میں مثل اپنے والد کے رسوخ حاصل نہ ہوا اور سبب اس امر کا وہی آغا میر کی چشمک تھی۔ منور الدولہ بہادر سے اور ان سے نہایت تپاک تھا۔ ممکن ہے ان دونوں صاحبوں کی دوستی کے کچھ اسباب ہوں لیکن ہم کو جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ جناب انیس کو فن تیر اندازی میں بدطولے حاصل تھا۔ گویا کبھی تیر خطا ہی نہ کرتا تھا۔ منور الدولہ بہادر کو بھی تیر لگانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر شکار میں ان دونوں صاحبوں کا ساتھ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو ان سے بہت انس تھا۔ منور الدولہ بہادر کی محبت کا اندازہ اس حکایت سے ہوتا ہے۔

واقعہ

ایک مرتبہ منور الدولہ بہادر نے شکار نجف لے جانے کا ارادہ کیا

ملازموں کو حکم دیا کہ سامان درست ہو جب تیار ہو گیا۔ آدمی کو حکم دیا کہ جناب اُنس
کی خدمت میں جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ سامان شکار تیار ہے۔ فتاب کی دیر ہے
آدمی روانہ ہوا اور جناب اُنس کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔ یہ فوراً اُٹھے اور اپنا سامان
درست کرنے لگے۔ جب جناب اُنس کے آنے میں دیر ہوئی تو منور الدولہ نے ہاتھی
منگوایا اور اُس پہ سوار ہوئے۔ اور برابر اپنے صاحبزادہ امجد علی خاں بہادر کو بٹھایا۔
اور یہ حکم دے کر کہ جناب اُنس تھوڑی دیر میں تشریف لانے والے ہیں۔ اُن کو
فلاں سواری پر روانہ کر دینا۔ اور شکارگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو ہی قدم فیل
کوہ پیکر نے جنبش کی تھی کہ فنس جناب اُنس کی نمودار ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ میر صاحب قبلہ
تشریف لا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے وہ سامنے فنس آ رہی ہے۔ فیلبان کو حکم دیا کہ
ہاتھی روکے۔ اُس نے روک لیا اتنے میں میر صاحب کی فنس بھی آ پہنچی کہاروں
نے (بول مہرا) کہہ کر فنس کاندھوں سے اُتار کر زمین پر رکھی۔ میر صاحب باہر تشریف
لائے سلام کیا۔ جواب سلام دینے کے بعد فرمایا کہ معاف کیجیے گا۔ آپ کو کسی قدر
دیر ہوئی۔ اور یہاں آتش شوق اس قدر بھڑکی کہ بغیر آپ کے دانہ ہونے پر مجبور ہو گیا
یہ فرما کر ہاتھی کو بٹھانے کا حکم دیا۔ جب وہ بیٹھا تو اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ تم دوسری
سواری پر آؤ۔ اور میر صاحب سے کہا آیئے۔ ہر چند میر صاحب نے کہا آپ صاحبزادہ کو
کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ میں دوسری سواری پر آ جاؤں گا۔ لیکن منور الدولہ بہادر نے
نہ مانا اور کہا۔ ارے بھئی آؤ ہم تم باتیں کرتے چلیں گے راستہ خوب کٹے گا اور میر صاحب
اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور روانہ ہو گئے۔ امجد علی خاں بہادر کو بمقتضائے سن یہ امر ناگوار ہوا اور
اتنا کہ شکار پر تشریف بھی نہ لے گئے۔ بلکہ اپنے دولت خانہ پر واپس آ گئے اور کئی روز تک

اپنے والد ماجد کے اسرار کو جمع دسترخوان پر جہاں روزانہ کھانا کھاتے تھے نہ حاضر ہوئے
باپ نے بھی نہ بلوایا رفتہ رفتہ یہ راز سب کو معلوم ہو گئی۔ تا آنکہ معزز مصاحبوں نے
امجد علی خاں صاحب بہادر کو سمجھایا اور یہ دسترخوان پر حاضر ہوئے منور الدولہ بہادر نے
فرمایا۔ تم کئی روز سے کہاں تھے کہ کھانے میں شریک نہ ہوئے عرض کیا۔ کچھ طبیعت اچھی
نہ تھی۔ فرمایا۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ہم کو جو سب ہی وہ معلوم ہے۔ اگر تم زندگی بھر کھانے میں
نہ شریک ہوتے تو میں بھی زندگی بھر نہ بلواتا۔ یاد رکھو! اُنس اور منور الدولہ ایک روح
اور دو قالب ہیں۔ جناب اُنس کو بھی منور الدولہ سمجھو۔ اور اگر یہ نہ سمجھو تو چچا تو ضرور ہی
سمجھو۔ فرماں بردار بیٹے نے گردن جھکا لی۔

لکھنؤ اور ۱۸۵۷ء | اس سے قبل تحریر ہو چکا ہے کہ جناب اُنس کا اسم مجرائیوں میں تھا جب انقلاب
سلطنت ہوا اور واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے تو وہ جاتا رہا ۱۸۵۷ء کے غدر میں
سب ہی کو بھاگنا پڑا۔ سرکار کمپنی کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا گیا ان کا خاندان بھی
کہیں چلا گیا۔ گوروں اور ہوٹوں نے تمام شہر کا نقد و جنس لوٹ لیا۔ ان کا بھی مال و اسباب
غارت ہو گیا۔ امن و امان ہو جانے پر سب آ کر آباد ہوئے۔ ان کا خاندان بھی آیا چونکہ
مال و متاع لٹ گیا تھا اور کوئی ملازمت کا سلسلہ ہی نہ تھا۔ اس وجہ سے تکلیف میں
بسر ہونے لگی اور ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ اور ان مصائب نے اُنس کے جوہر
قناعت پر اور جلا کی۔ لیکن بمفاد اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اُن ساعتوں کے آثار بھی ظاہر ہونے
لگے جو آئندہ ایک زمانہ تک اُنس کو ایک فرد فارغ البال کا لقب عطا کرنے والی تھیں

اُنس بر سرِ کار ہوتے ہیں | جب نواب ملکہ جہاں جو محمد علی شاہ کی بی بی تھیں لکھنؤ آئیں تو اُن کو ایک
داروغہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک تحریر منور الدولہ بہادر کے پاس اس مضمون کی بھیجی

تم ہمیشہ سے ہمارے یہاں کے خیر خواہ رہے ہو اور امید ہے کہ اب بھی تمہارا وہی خیال ہوگا۔ ہم کو ایک لائق اور متدین اور منتظم داروغہ کی ضرورت ہے اگر تمہارے علم میں کوئی ایسا شخص ہو تو ہمارے پاس بھیج دو۔ اس تحریر کے دیکھتے ہی منور الدولہ کے ذہن میں جناب انس ہی آئے۔ آدمی بھیج کر انکو بلوایا اور وہ تحریر دکھا کر کہا کہ میں نے آپ کو تجویز کیا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو بلایا ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ اور کہا عورت کی ملازمت میں ناپسند کرتا ہوں۔ قصہ کوتاہ منور الدولہ بہادر نے اتنا اصرار کیا کہ میر صاحب کو مجبوراً منظور ہی کرنا پڑا۔ منور الدولہ بہادر نے نواب مکہ جہاں کو جواب میں لکھ دیا۔ کہ میں نے موافق آپ کی منشا کے ایک صاحب کو تجویز کر دیا ہے اور وہ فلاں روز حاضر ہونگے۔ میر صاحب قبلہ اس قدر مفلس تھے۔ کہ لباس کا انتظام بھی جیسا کہ چاہیے نہ تھا۔ اور اس فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ کہاں سے لباس کا انتظام کروں۔ کہ اتنے میں حسین قدر بہادر کے استاد مولوی شیخ احمد حسین صاحب جو میر صاحب کے شاگرد تھے آئے اور متردد دیکھ کر عرض کیا کہ آج کچھ میں آپ کو متفکر پاتا ہوں۔ فرمایا کچھ نہیں۔ انھوں نے فرمایا میں نہ مانوں گا کوئی نہ کوئی فکر تو ضرور ہے۔ میر صاحب قبلہ نے سارا قصہ بیان کر دیا وہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور بعد اس کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئے اور میر صاحب کی خدمت میں ایک رومال جس میں چالیس اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پیش کیا میر صاحب کو اپنی تمام عمر میں ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا مارے شرم کے پسینے پسینے ہو گئے۔ گردن جھکا کر صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے عرض کیا۔ آپ کچھ اور خیال نہ فرمائیے یہ میں آپ کو قرض دیتا ہوں۔ جس وقت آپ کے پاس ہو۔ آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ لے لوں گا۔

اس پر بھی میر صاحب نے انکار ہی فرمایا۔ لیکن اُنھوں نے اصرار کو اس حد پر پہنچایا
کہ اُن کو لیتے ہی بن پڑی۔ میر صاحب نے کپڑوں کا انتظام کیا۔ اور تاریخ معینہ پر
ڈیوڑھی پہ حاضر ہوئے۔ محل دار نے جاکر دست بستہ بیگم صاحب سے عرض کی حضور
وہ میر صاحب حاضر ہیں۔ بیگم صاحب نے فرمایا۔ کون محل دار نے کہا حضور ماتم کے
یاد نہیں رہا۔ بھلا سا بتایا تھا۔ وہی میر صاحب جن کے بارے میں منور الدولہ نے
لکھا تھا۔ فرمایا۔ ہاں ہاں۔ انھیں جاکر بٹھاؤ پھر پردہ کرکے اندر بلایا۔ اور بعد آرام کے
آیا۔ سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کی اور اُس وقت ایک ہزار روپیہ اور ایک خلعت
مرحمت فرمایا میر صاحب اپنے فرض منصبی کو انجام دینے لگے۔

بیسویں حکایت ایک روز ملکہ جہاں نے فرمایا" داروغہ صاحب ہمارے پاس بارہ لاکھ کے
پرانے سرکاری نوٹ تھے۔ صندوقچہ میں رکھے تھے۔ اُن کا پتہ نوٹ میں غائب ہو گیا
کسی طرح اُن کا پتہ لگاؤ۔ شاید دستیاب ہو جائیں۔" میر صاحب نے عرض کی "بہت
خوب۔ خیال رکھوں گا۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ اُن کا ملنا دشوار ہے"
صاحب تاریخ اودھ لکھتے ہیں۔ بعد غدر نوٹوں کی اس قدر ستیاناسی ہوئی تھی
کہ بیان سے باہر ہے۔ اور نئے آدمیوں کے پاس ہزاروں کے نوٹ دکھائی دیتے
تھے۔ مگر سرکار نے ممانعت کر دی تھی۔ کہ کوئی نوٹ نہ خریدے۔ اُس پر بھی ہزار کا نوٹ
دس روپیہ کو فروخت ہو گیا اور لوگ مالا مال ہو گئے۔ چونکہ ممانعت خرید ہو چکی تھی۔
لہذا ملکہ جہاں کے نوٹ بک نہ سکتے تھے۔ عجب اتفاق پیش آیا۔ یا یہ کہیے۔ کہ اُس کی
قسمت جاگی۔ وہ صندوقچہ ایک سکھ لے گیا تھا۔ اُس میں جو کچھ نقد تھا وہ تو اُس نے لیا
مگر نوٹ اُس کے مطلب کے نہ تھے۔ اُن کو لے کر ابو تراب خاں صاحب جن کا ذکر مشہور ہے

اُن کے پاس گیا۔ اُنھوں نے پانچ سو دے کر اُس سے لے لیے۔ یہ خبر میر صاحب کو بھی کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی۔ میر صاحب اُن کے پاس گئے۔ اور دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ ہاں میں نے یہ مقدار دے کر لے لیے ہیں۔ میر صاحب نے کہا۔ وہ نوٹ ملکہ جہاں کے ہیں۔ آپ اُنھیں دے دیں۔ اور جو رقم آپ نے دی ہے وہ مجھ سے لے لیں اُنھوں نے جواب دیا۔ میں اس رقم پر نہ دونگا۔ بلکہ اس مثل کے موافق۔ کہ "جاتا دھن دیکھیے تو آدھا بیچیے بانٹ" چھ لاکھ روپیہ لونگا۔ غرض کہ میر صاحب دس ہزار تک دیتے رہے مگر یہ معاملہ طے نہ ہوا +

نوٹ مل گئے | شاہی زمانہ میں میر صاحب نے ایک انگریز کو ٹرایا تھا۔ اب اس وقت میں وہ چیف کمشنر ہو کر آئے۔ یہ جوان کو معلوم ہوا۔ یہ ملنے گئے صاحب اپنے اُستاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت احترام سے بٹھایا۔ اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اثنائے کلام میں میر صاحب نے نوٹ والا قصہ بھی بیان کیا۔ چیف کمشنر نے کہا۔ "کل ہم اُن کو بلوا کر دلوا دے گا" دوسرے روز ابو تراب خاں صاحب کے یہاں چپراسی پہنچا۔ اور جا کر کہا۔ چیف کمشنر صاحب نے آپ کو بلایا ہے یہ سُن کر وہ گھبرا گئے اور ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور سبب اس کھلبلی مچ جانے کا یہ تھا۔ کہ اُس وقت جس پر نامی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کو سزائے موت یا اور دوسری سزائیں دی جاتی تھیں۔ غرض کہ ابو تراب خاں صاحب گئے صاحب نے نوٹ میر صاحب قبلہ کو دلوا دئے۔ اور پانچ سو روپیہ میر صاحب نے ابو تراب خاں صاحب کو دے دیے۔

داروغہ صاحب خوش خوش نوٹ لے کر آئے۔ اور نواب ملکہ جہاں کے سامنے پیش کر دیے وہ مغفور میر صاحب کی اس کارگذاری پر بہت خوش ہوئیں۔

اور کھوئے ہوئے لوٹا کے مل جانے پر بہت تعجب کیا۔ اس حسن سعی کی وجہ سے اُن کے دل میں بہت جگہ ہوگئی اور اُن کی بہت رعایت کرنے لگیں۔ بلکہ مثل عزیزوں کے سمجھنے لگیں +

نواب ملکہ جہاں کی خواہ مخواہ بدنامی

دوسرا کارنامہ میر صاحب سے ایسا ہوا جس کی وجہ سے نواب ملکہ جہاں اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اُنھیں چیف کمشنر صاحب کے پاس کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ایک روز صاحب نے کہا "آپ ہمارا اُستاد ہے۔ اگر کوئی کام ہو تو فوراً ہم سے کہیے ہم اُسے ضرور کر دے گا"۔ انھوں نے کہا "ہمیں آپ سے یہی اُمید ہے۔ میرا تو اس وقت کوئی کام نہیں۔ البتہ میں جن کا ملازم ہوں اُن کا کام ہے۔ اگر آپ اُسے انجام دے دیں تو میں نہایت ممنون ہونگا۔ صاحب نے کہا وہ کیا؟ میر صاحب نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے میں نواب ملکہ جہاں کا داروغہ ہوں۔ اور وہ بی بی محمد علی شاہ کی ہیں۔ افسوس ہے کہ سرکار کمپنی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ایسی جلیل القدر بیگم کی کچھ تنخواہ نہ ہوئی۔ صاحب نے کہا۔ اچھا۔ ہم کوشش کرے گا۔ میر صاحب وقتاً فوقتاً وہ محبت نامے جو محمد علی شاہ نواب ملکہ جہاں کو لکھتے تھے۔ اور یہ اُن کو لکھتی تھیں۔ اور دوسرے کاغذات شاہی تلاش کر کے نکالتے اور چیف کمشنر صاحب کو دکھلاتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر نواب ملکہ جہاں کا مرتبہ ظاہر ہوگیا اور آخر کار اُنھوں نے ایسی رپورٹ کر دی۔ کہ کئی ماہ کے بعد ساڑھے چار ہزار کی پنشن کا حکم آگیا۔ صاحب نے یہ حکم میر صاحب کو سُنایا۔ میر صاحب کی اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض میر صاحب اپنی سعی میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ سارا قصہ نواب ملکہ جہاں سے بیان نہ کیا۔ جب مہینہ ختم ہوا تنخواہ جا کر وصول کی۔ اور اُسے لیے ہوئے بیگم صاحبہ کی

خدمت میں آئے۔ اور ہاتھ لاکر رکھ دیئے۔ بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے
میں میر صاحب نے عرض کی، آپ کی تنخواہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا کیسی تنخواہ میر صاحب نے
اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ ان کی اس کوشش پر بہت ہی خوش ہوئیں
اور اُس روز سے اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اور چاہا کہ اس کا صلہ خاطر خواہ دیں لیکن
میر صاحب نے انکار کیا۔ اور عرض کی اس کا صلہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ تمام بزرگان
دین کے مزارات کی زیارت کے لیے سفر فرمائیں اور مجھے بھی ساتھ لیجئے۔ بیگم صاحبہ
راضی ہوگئیں۔ سامان سفر درست ہوگیا۔ اور اس نتیجہ خیز سفر کی تاریخ بھی معین ہوگئی۔

چونکہ میر صاحب قبلہ ملکہ جہاں کے ہمراہ جا رہے تھے لہٰذا یہاں کے تمام انتظام
کے لیے ایک اور داروغہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے لیے میر صاحب کے
صاحبزادے جناب صابر تجویز ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار کی تنخواہ کی گئی
اور تمام کنجیاں اُن کے حوالہ کی گئیں۔ اور نقد و جنس و جواہرات اور تمام اثاثہ کی دو
فہرستیں تیار ہوئیں ایک جناب صابر کو دی گئی۔ اور دوسری نواب ملکہ جہاں کے
پاس رہی تحویل میں نقد روپیہ بارہ لاکھ تھا۔ غرض کہ یہ سب انتظام ہو کر بیگم صاحبہ
حج اور زیارت عتبات عالیات کو روانہ ہوگئیں۔ اور سات برس تک اس مبارک سفر
میں رہیں نواب ملکہ جہاں کی اس سات برس کی مدت ہوجائے گی ہم لکھنؤ میں بعض واقعات
جو کر رہے ہیں وہ جناب صابر کے حالات میں لکھے جائیں گے۔

سابق نواب کلب علی خاں صاحب

جنت آشیاں نواب کلب علی خاں صاحب جیسے علم دوست
اور قدردان اہل علم تھے سب کو معلوم ہے۔ کیسے کیسے باکمال فاضل عالم۔ شاعر۔ بلکہ
ہر فن کے جاننے والے۔ آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ میر صاحب کے علم و کمال کا شہرہ

آپ کے سمع ہمایوں تک پہنچا۔ بہت مشتاق ہوئے۔ اور چند بار تحریر کے وسیلہ سے طلب فرمایا۔ لیکن میر صاحب اس وقت ضعیف ہو گئے تھے۔ سفر کی صعوبت مدِ نظر رکھ کر پیرانہ سالی کا عذر واقعی کیا۔ آخر کار ۱۲۷۵ھ میں اپنے استاد جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی کو لیے کر یہ روانہ فرمایا۔ منشی صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ منشی محمد احمد صاحب خریر خلف امیر مینائی بھی ہمراہ تھے۔ میر صاحب سے ملاقات ہوئی منشی صاحب نے کہا میں آپ کے لینے کے لیے آیا ہوں۔ میر صاحب نے کہا دیکھیے میری یہ حالت ہے۔ منشی صاحب نے کہا۔ ظاہر ہے کہ عالم پیری ہے۔ لیکن آپ کو چلنا ضرور ہوگا۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہ راحت و آرام پہنچیں گے۔ غرض کہ میر صاحب نے منظور کیا اور خود مع جناب رشید و جناب عبد کے روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں رامپور میں ریل نہ تھی۔ مراد آباد آئے۔ اور وہاں سے رامپور پہنچے۔ دربار میں شرف ملازمت حاصل ہوا۔ جلال۔ امیر۔ داغ۔ جگر۔ وغیرہم موجود تھے۔ ایک عرصہ تک شعر و شاعری کا ذکر رہا۔ سلسلۂ سخن تاریخ پر پہنچا۔ بابت آشنائی ٹیپو سلطان کی تاریخ بیان فرمانے لگے۔ اور بہت دیر تک بیان فرماتے رہے۔ ایک مقام پر پہنچ کر خاموش ہو گئے۔ اور میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس کے آگے اگر آپ کو یاد ہو تو بیان کیجیے۔ میر صاحب نے عرض کی بہت خوب۔ اور وہیں سے بیان شروع کر دیا اور ایک عرصہ تک بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد عرض کی کہ حضور کی سمع خراشی کا خیال ہے۔ حکم ہو تو اور عرض کروں۔ مسکرا کر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو تاریخ میں بھی دخل ہے۔

ایک غزل میر صاحب کی سنی۔ اور ایک غزل اپنی سنائی۔ آٹھ روز تک وہاں قیام ہوا

کئی مرتبہ دربار میں گئے۔ کبھی کبھی رفقاء منزل میں بھی جاتے تھے +

داغ اور جناب انس

ایک مرتبہ رفقاء منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ فصیح الملک حضرت داغ آئے اور ایک کونہ میں ٹوپی اُتار کر بیٹھ گئے۔ اس زمانہ میں آپ میں آزادی زیادہ تھی۔ کسی نے میر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ حضرت آپ سے واقف ہیں۔ جواب دیا۔ نہیں کہا میر انس آپ ہی ہیں جلدی سے ٹوپی پہن کر سلام کیا۔ اور اُٹھ کر ملے۔ دوسرے دن قیام گاہ پر آئے۔ ہاتھ میں اپنا دیوان قلمی لیے ہوئے تھے۔ میر صاحب سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چلتے وقت اپنا دیوان دیا اور عرض کیا۔ کہ وقت فرصت آپ ملاحظہ فرمایئے گا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند غزلیں خود سُناؤں۔ مگر آپ کی تکلیف کا خیال ہوا۔ جناب داغ کے جانے کے بعد میر صاحب نے جناب رشید سے جستہ جستہ مقام سے پڑھوا کر سُنا۔ تیسرے دن جناب داغ کے تغزل کی تعریف کی اور کہا "دہلی عبارت آپ ہی سے ہے" جناب داغ سے اور جناب رشید سے بے تکلفانہ گفتگو اور ان کا انھیں۔ اور اُن کا انھیں غزلیں سُنانا خالی از لطف نہیں۔

الحاصل ایک روز نواب صاحب بہادر سے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ فرمایا۔ کہاں جایئے گا یہیں رہیے۔ عرض کیا۔ جی تو یہی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ آپ سا باکمال قدرداں رئیس کہاں دستیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن بُرا ہو ضعیفی کا کہ اس سعادت سے محروم رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک رومال اور دو شالہ۔ اور چھ سو روپیہ مرحمت فرما کر رخصت کیا +

میر صاحب خطِ شفیعہ خوب لکھتے تھے۔ یہی خط شفیعہ زمانۂ شاہی میں اس قدر مروج تھا (اور واقعی مروج ہونے کے قابل بھی ہے) کہ ہر پڑھا لکھا اُس کی مشق کرتا تھا۔ مگر اُس

خط کے لئے بہت لوچ کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے خوش خط حضرات شفیہ اچھا نہیں لکھتے عام طور سے یہ خط ایرانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اکثر پرانے کتب خانوں میں فارسی کے قلمی نسخے ایک اسی خط میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں یہ حروف شفیہ، خوش خط الفاظ سے زیادہ نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

سخاوت | میر صاحب میں فضیلت سخاوت درجۂ کمال پر تھی۔ جب کسی حاجت مند کو دیکھ لیتے تھے۔ اُس وقت اور کوئی خیال اُن کے دماغ میں راہ نہیں پاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی طرح جلد سے جلد اس کی حاجت روائی کی کوئی تدبیر کریں۔ اور بیشتر کامیاب ہی ہوتے تھے۔ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کے غربا کے لیے میر صاحب گویا حاتم ثانی تھے۔ جناب حمید فرماتے تھے کہ نادار اصحاب کی لڑکیوں کے لیے اکثر ایسی ایسی معقول رقمیں میر صاحب نے دی ہیں کہ لوگوں کو تعجب ہو گیا۔

واقعہ | ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میر صاحب رکاب گنج میں کھڑے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شالی رومال کاندھے پر پڑا تھا۔ نیمی چولی کی جامہ دار کی اچکن پہنے تھے جو جدید بنوائی تھی۔ اُن کو امیر صورت شریف وضع پاکر ایک سائل نے سوال کیا میر صاحب نے ایک رقم قلیل جیب سے نکال کر دی اُس نے کہا میں اور زیادہ کا محتاج ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ سائل نے کہا۔ کپڑے تو ہیں۔ میر صاحب نہ معلوم اُس وقت کس عالم میں تھے ملازم سے کہا گھر سے لنگی مانگ لے۔ اس نے امتثال امر کیا۔ سب کپڑے اُتار کے فقیر کے حوالہ کیے۔ حالانکہ اُس بے چارے نے لجاجت سے کئی مرتبہ کہا "غریب پرور میری یہ غرض نہ تھی۔ مگر جب اُس نے میر صاحب کو جوش سخاوت میں برہم پایا۔

تو مجال عذر کہاں سے لاتا۔ ناچار قبول کیا۔ اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

سرجیبی | واقعی میر انس کو ایسا ہی سیر چشم ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ابتدا سے انھوں نے ایسی ایسی سرکاروں میں ملازمت کی تھی۔ جہاں شاہانہ شان و شوکت نظر آتی تھی کام وہ تفویض ہوئے تھے۔ کہ ہر وقت سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپیہ ہاتھ سے نکلتے رہتے تھے حرص و ہوی کا ذکر نہیں۔ اگر ایسا شخص بھی سخی نہ ہو تو تعجب ہے۔ علاوہ اوپر کی آمدنی کے جس کی کچھ انتہا نہ تھی۔ خود میر صاحب تنخواہ بھی معقول پاتے تھے (یعنی دو سو روپیہ ماہوار) اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب ایک روپیہ آج کل کے دس روپیہ کی برابر تھا۔ پھر اُس پر روزانہ کے عنایات مزید۔ چنانچہ جب میر صاحب نے کوشش کر کے نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ کی تنخواہ کرائی۔ اُس وقت اُنھوں نے بجائے دو سو روپیہ کے چار سو روپیہ تنخواہ کر دی۔ اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ کسی دوسرے موقعہ پر ایک مرتبہ اور پچیس ہزار روپیہ اُسی قدر شناس بیگم نے میر صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ تاکہ میر صاحب اولاد کے لیے کوئی جائداد خرید لیں اور وسیلۂ معاش قائم ہو جائے۔ مگر میر صاحب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ بھلا روپیہ کہاں رُک سکتا تھا۔ جو ملا صرف کیا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب ملکہ جہاں کے انتقال کے بعد میر صاحب سیر چشم مفلس رہے۔

جب ملکہ جہاں کربلائے معلی تشریف لے جانے والی تھیں اُن کے ہمراہ تقریباً دو سو آدمی تھے۔ اُن کے علاوہ میر صاحب سے جس نے سفر کربلا کی استدعا کی میر صاحب نے اُس کو بغیر بیگم صاحبہ کو اطلاع دیے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اس طرح ایک کافی تعداد زائرین کی ساتھ لے جا کے ذخیرۂ ثواب حاصل کیا۔

لطیفہ | میرزا محمد رضا برق اُستاد جلال لکھنوی ایک مقبرہ میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ میر انیس صاحب کی فنس نکلی۔ کسی وجہ سے میر صاحب میرزا محمد رضا کے یہاں جاتے نہ تھے۔ برق میر صاحب کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بہت جھک کے سلام کیا۔ آپ کی عادت تھی کہ صاحب سلامت بہت جھک کے کرتے تھے۔ میر صاحب نے فنس میں سے اُسی طرح آپ کو بھی بہت جھک کے سلام کیا۔ میرزا صاحب نے کہاروں کو آواز دی۔ ذرا فنس کو روکو۔ اور میر صاحب سے پکار کر کہا۔ یہاں بھی آپ کبھی آیئے گا؟ کہا۔ ہاں آؤں گا تو ضرور مگر ابھی تو جی نہیں چاہتا۔

انیس اور مشاعرے

لطیفہ | شاہی زمانہ میں آغا علی خاں شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ تمام شعرائے شہر جمع تھے۔ آغا علی خاں سے اور میر انیس صاحب سے قدیمی چشمک تھی۔ اس لیے خود تو نہ گئے۔ بلکہ جناب آغا حیدر صاحب نیشاپوری کے وسیلہ سے آپ کو بلوایا۔ میر صاحب جناب تعشق کو ساتھ لے کر پہنچے۔ دیکھا مشاعرہ شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ چوب دار سے دو کرسیاں منگوا کر باہر بیٹھے۔ آغا حیدر صاحب اور میر علی اوسط کو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے ہیں۔ فوراً اُٹھے۔ اور آواز دی "آیئے بھائی صاحب" انھوں نے کہا۔ اندر جگہ نہیں جب میری باری آئے گی چلا آؤں گا۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور اندر بلا ہی لیا۔ اندر جا کر بیٹھے۔ جب ان کی باری آئی۔ غیر طرح غزل پڑھی۔ اُس کے بعد طرح میں پڑھی۔ ایک شعر پر آغا علی خاں صاحب نے کہا۔ جناب نے تو اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ گویا یہ فقرہ طنز آمیز تھا۔ میر انیس نے فوراً جیب میں غزل رکھ لی۔ آغا علی خاں اور دیگر حضرات نے کہا۔ کیوں کیوں فرمایئے فرمایئے

آغا علی خان سے تو کچھ نہ کہا۔ دوسروں کی طرف میر صاحب نے خطاب کر کے کہا۔ آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ اور آپ نے تعریف کا خاتمہ کر دیا۔ اب کیا پڑھوں گا۔

رؤسائے عہد اور اُنس

شاہزادہ میرزا سلیمان قدر بہادر جو خاندان شاہان اودھ کے آخری مقتدر فرد تھے۔ کبھی کبھی اکابرین لکھنؤ سے یا تو خود ملتے تھے۔ یا اُنھیں بلوا لیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر اُنس مرحوم کے پاس ہرکارہ طلب پہنچا۔ مگر میر صاحب نے عذر پیرانہ سالی کیا نواب مغفور رکاب گنج خود تشریف لائے۔ سڑک پر گاڑی رکی۔ میر اُنس صاحب نے اپنی فلنس لگوا دی۔ اور نواب صاحب کی فلنس کے ساتھ ساتھ گھر تک تشریف لائے۔ اگرچہ میر صاحب کو اس دفعہ مہمان نے بہت کمزور پا کر فلنس کے ساتھ چلنے کی خواہش کی مگر اس وضع قدیم کے پابند نے نہ مانا اور اپنے حسن اخلاق اور عقیدت کو یوں ظاہر کیا۔ میر صاحب نے کمرہ میں گاؤ تکیہ لگوا دیا تھا۔ نواب مغفور آکر رونق افروز ہوئے۔ میر صاحب نے موافق رسم قدیم ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر رکھائے۔ اُنھوں نے فقط ہاتھ رکھ دیا جب تک بیٹھے رہے شعر و سخن کے اذکار رہے۔ خود بھی اپنا کلام سُنایا۔ اور میر صاحب سے بھی سُنا۔ جب چلنے لگے تو میر صاحب کا دیوان باصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ جو اب تک اُن کے صاحبزادہ شاہزادہ ثریا قدر بہادر کے پاس موجود ہے۔ اور میر صاحب کو ایک دوشالہ اور دو سو روپیہ بھیجے۔

جناب اُنس وقت آخر بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ دس جمادی الاول ۱۳۰۲ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ پچانوے برس کی عمر پائی۔ حکیم صفدر حسین صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی جو قبر پر کندہ ہے۔ اسکنہ اللہ ریاض الجنۃ۔

۱۳۰۲ھ

اولادِ اُنس | محمد میرزا صاحب اُنس کے پانچ بیٹے تھے۔

حسین میرزا عشق۔ احمد میرزا صابر۔ سیّد میرزا تعشق۔ سیّد عباس میرزا صبر
سیّد نواب میرزا عاشق +

ان سب حضرات کی شاعری کا سلسلہ اُستادِ وقت جناب شیخ ناسخ مغفور سے ہے
ان حضرات کا حال بھی مختصراً درج ذیل ہے۔

اشعار میر اُنس مغفور (شاگرد ناسخ)

رسا جو اُلفتِ زُلفِ دراز ہو جائے — کمند بامِ حقیقت مجاز ہو جائے
تمہیں لحد میں اُتارو تمہیں پڑھو یا تلقیں — کہیں تو صحبتِ آوازِ نیاز ہو جائے
عطا ہو ضبط مجھے یا اجل سے کچھ کہہ دو — کوئی تو صورتِ اظہارِ راز ہو جائے
غرض وفا و جفا سے نہیں وہ جاں جلو — کہ مجھ میں غیر میں کچھ امتیاز ہو جائے

وفورِ شوقِ شہادت سے بے قرار آئے — حضور جلد برآمد ہوں جاں نثار آئے
کسی طرح نہ ملا قاصدوں کو خط کا جواب — ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے

جان دی پر کی نہ منّت اُس ستم ایجاد کی — بد دماغی دیکھنا میرے دلِ ناشاد کی
اپنی اُلفت کا مآل اچھا نظر آتا نہیں — اُن کو عادت بھولنے کی ہم کو عادت یاد کی
درد و غم سے بڑھ گیا ہے ربط ہجر یار میں — اب قیامت پر گئی شادی دلِ ناشاد کی
مجھ سے اک بُت کی محبّت میں کنارہ کر گیا — اب خدا صورت نہ دکھلائے دلِ ناشاد کی
کر کے تہمت بے قراری کی نہ آزردہ ہو یار — میں نے کس دن ہجر میں نالہ کیا فریاد کی

شعر گوئی کا مزا اے انس کب باقی رہا
رو دیا صاحب حضرتِ ناسخ کی شفقت یاد کی

کیا مزے تو نے دیے ہیں رحمت اے تاثیرِ ضعف
لب تک آسکتا نہیں شکوہ ہمارے دل میں ہے

رات بھر دل سے رہیں رنج و تعب کی باتیں
فرقتِ یار نے سنوائیں غضب کی باتیں

اتنی تخصیص یہ مسرور ہے دل واہ رے دل
چشم پوشی ہے رقیبوں سے اشارے ہم سے

طول میں ہیں جو ترے قد کے برابر گیسو
کہیں برپا نہ کریں فتنۂ محشر گیسو
واہ ری مہر و وفا عاشقِ گیسو جو مُوا
پھر نہ چھوڑے کبھی اُس شوخ نے مُنہ پر گیسو

حسین میرزا عشق

لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں تھے۔ دیوان اور مرثیوں کی جلد بھی چھپ چکی ہے۔ ان کا کلام اصولِ شاعری کی میزان میں تُلا ہوا ہے۔ جہاں انیس و دبیر کے کلام کے لوگ مشتاق ہوتے تھے۔ وہاں ان کا کلام بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اول الذکر دونوں صاحبوں کی شہرت کے برابر برابر ان کا شہرۂ کمال بھی تھا۔ محقق فن ایسے تھے کہ دوسرا نگاہوں میں نہیں سماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنؤ کے باکمالوں کی فہرست اول میں ان کا نام نامی بھی نظر آتا ہے۔ اب ان کے پوتے جناب عسکری میرزا صاحب مؤدب، آبائی جاگیر نظم کے مالک ہیں اور آج کل لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔

جناب مؤدب کو رشید مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جس طرح جناب رشید نے اپنے مرثیہ میں، ہوں سلطانِ سخن مجھ سے بڑی شانِ سخن میں ایک موقع پر

دستار ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو،

کہہ کے شاگردی عشق پر ناز کیا ہے۔ اسی طرح جناب مؤدب نے ذیل کی رباعی میں فخراً شاگردی رشید ظاہر کی ہے۔

عمو ہیں رشید اُن سے یہ رشتہ ہے	دادا مرے عشق اُن کے چچا شاگرد ہے
یہ عشق کے شاگرد ہیں شاگرد رشید	تلمیذ کا یہ سلسلہ بھی اچھا ہے

رجب کی ستائیس تاریخ اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں سجاد حسین صاحب ایک مجلس کرتے ہیں۔ اُس میں جناب مؤدب اپنا نیا مرثیہ سناتے ہیں۔ اس ماہ رجب کی چوبیس تاریخ سے نئے مرثیوں کی مجالس شروع ہو جاتی ہیں۔ اور خاندان انیس و دبیر

وعشق کے چست مرثیہ گو مثلاً عروج، رفیع، مؤدب، فائق، حسن، قدیم، فرید، رونق افروز ممبر ہوتے ہیں۔ یہی ایک مرثیہ ہر ایک کی نسبت سال بھر تک ایک سماں قائم کرا دیتا ہے۔ سنجیدہ طبیعتیں نقادانہ نظر ڈال کے کامیابی کی مختلف تعریفوں سے ہر ایک کو سرفراز کرتی ہیں۔ جو اس امتحان گاہ میں عہدہ برآ ہو گیا۔ اُس کی امیدوں کا کیا پوچھنا۔

جناب عشق نے بتاریخ ۲۴ شعبان ۱۳۰۳ھ روز دوشنبہ انتقال فرمایا۔

سید میرزا تعشق

لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ غزل اور مرثیہ گوئی دونوں کے بادشاہ تھے۔ خداداد طبیعت نے مرثیہ گوئی کا ایک نیا اور ہر دل عزیز رنگ ایجاد کر لیا تھا جس مشاعرہ میں غزل پڑھ دیتے تھے۔ سامعین بے تاب ہو جاتے تھے۔ داد دینا کیسا کلام نے وہ اثر پایا تھا کہ لوگ رو دیتے تھے۔ ان کے کچھ مرثیے اور مختصر سا دیوان غزلیات طبع ہو گیا ہے۔ دیوان غزلیات جناب آبر مرحوم اڈیٹر رسالہ معیار چھپوایا

جناب تعشق سے میر انیس صاحب بہت محبت کرتے تھے۔ بلکہ ان دونوں بزرگواروں میں برادرانہ مراسم تھے۔ ایک معتبر ذریعہ سے سُنا گیا ہے کہ میر انیس مغفور اکثر اپنا نیا مرثیہ آپ کو سُنا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سوائے انتہائے الفت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

کم سرت کی وجہ سید صاحب نے اپنا زیادہ حصۂ عمر کربلائے معلّٰی میں صرف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ میر عشق مغفور کا چراغ لکھنؤ میں جل رہا تھا۔ مگر انھوں نے جو نئے مرثیے کہے اور مجلسوں میں پڑھے تو مرجعیت عام ان کی طرف ہونے لگی۔ سمجھے کہ اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھتا ہوں تو زمانہ میر عشق کا مدِ مقابل بنائے دیتا ہے۔ جس کو یہ نا

کرتے تھے۔ لہذا دوبارہ زیارت کربلائے معلّٰی پر آمادہ ہوگئے۔ گو باارادۂ ہجرت کرلیا۔ میر عشق کے انتقال کے بعد واپس آئے۔ اور پھر وہ شہرت حاصل کی کہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ایک فرزند سیّد نواب میرزا تعلّق مرحوم تھے۔ یہاں ان دونوں حضرات کے مفصّل حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مقصود میر ارشید کے حالات سے ہے۔ روشِ تحریر اس طرف کھینچ لائی تو ان حضرات کا بھی مجملاً ذکر ہوگیا۔

سیّد صاحب نے ستّر سال کی عمر پائی۔ ۴۔ رمضان المبارک روز شنبہ ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ باغ میر عشق میں زیر امام باڑہ ایک حجرہ ہے۔ اس میں مدفون ہوئے۔ ناسخ وقت جناب مولوی علی میاں صاحب کامل مغفور نے یہ تاریخ وفات کہی

از زبانِ ہاتفِ غیبی بپاسخ گویمش　　رفتہ سوئے مجلسِ جانِ ہمیر آں جناب
۱۳۰۹ھ

احمد میرزا صاحب صابر

جناب صابر۔ یہ محمد میرزا صاحب انس کے منجھلے بیٹے اور جناب رشید کے والدِ ماجد تھے۔

حلیہ و لباس | رنگت گوری تھی۔ ماتھا بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ کثرتِ کتب بینی سے نظر کمزور ہوگئی تھی۔ موٹے تازے تھے۔ رسمِ قدیم کے موافق سر پر پٹے تھے۔ اعضا میں بہت مناسبت تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خوب صورت تھے وضع اصل سادی تھی نیچے گوشہ ٹوپی پہنتے تھے۔ کرتہ نیچا۔ آٹھ کلی کا مشروع کا پائجامہ ہوتا تھا۔ جوتہ گھیتلا اشرفی کا بیر علی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔ بیر علی اس وقت لکھنؤ میں گھینلے جوتہ کی ساخت میں بہت مشہور تھا اکثر رؤسا و شرفائے شہر اس کے ہاتھ کا جوتہ پہنتے تھے۔ چنانچہ میر انیس میر مونس

جناب صابر نے ہمیشہ اسی کا بنا ہوا جوتہ پہنا کیا وضع کے پابند لوگ تھے۔

سوں تعلیم اور اولاد علم سے بہرہ

جناب صابر بڑے ذی استعداد تھے۔ مولوی انور علی صاحب فرنگی محلی مرحوم سے درسیات ختم کیے تھے۔ اور بجائے خود کتب بینی سے اس قدر قوتِ علم بڑھائی تھی۔ کہ طالبانِ علم گھر پر درس لینے آتے تھے۔ ان کے نمایاں شاگردوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حکیم سید باقر مرحوم۔ میر اولاد علی مرحوم۔ شیخ ہادی علی مرحوم۔ میر عسکری مرحوم۔ شیخ نثار حسن علی مرحوم + جناب صابر تینوں زبانوں (یعنی عربی۔ فارسی۔ اردو) میں شعر کہتے تھے۔ اور شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ کیفِ علم میں اس قدر سرشار تھے۔ کہ کبھی صنفِ شعر میں زیادہ نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس قدر کہا کہ قابلِ اشاعت ہوتا۔

شاذ سے قطع نظر کر کے قاعدہ ہے کہ ایک صاحبِ استعداد اگر فطرتاً ذوقِ شعر رکھتا ہے۔ تو اُس کو کبھی اس حد تک نہیں پہنچاتا کہ شاعری کے بڑھتے ہوئے خیالات اس کو مسائلِ علمیہ کی فکر سے باز رکھیں۔ جو کیفیت شاعر پر دورانِ نظم میں طاری ہوتی ہے اور جن کاوشوں سے وہ ایک خیال کو نظم میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور کامیاب ہو کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک درس دینے والا مسائلِ علمیہ کے حل میں غرق ہو کے وہ لطف اُٹھاتا ہے کہ فضلا ہی خوب سمجھتے ہیں +

شاعر کا بدل مایتحلل دادِ سخن ہے۔ اور مدرس کے رُوحانی سرور کا سبب یہ ہے کہ جو کچھ اُس نے تقریر کی ہے وہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے۔ بہر حال جناب صابر نے اپنے وقت کو صرفِ علم کر دیا۔ اور شعر کی طرف توجہ کم کی۔ آتش و ناسخ کے مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں سے دادِ سخن لی ہے +

اسی سلسلہ | ۱۰ امجد علی شاہ کی تخت نشینی کے ایک سال قبل یعنی ربیع الاول ۱۲۶۲ھ ہجری میں جناب صابر کا عقد فردوسی ہند جناب انیس مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا۔ جن کا انتقال رشید کے سامنے ہوا + انیس مرحوم ان صاحبزادی سے خصوصاً بہت محبت فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جناب صابر بھی بہت محبوب تھے جناب رشید فرماتے تھے کہ نانا جان مہینہ میں دو ایک مرتبہ والدہ کو دیکھنے ضرور تشریف لاتے تھے اور جناب انس مغفور کے ساتھ کھانا نوش فرماتے تھے جتنے عرصہ تک قیام رہتا تھا ان دونوں بزرگوں میں فن شعر کے متعلق اس قدر دلچسپ اذکار ہوتے رہتے تھے گویا دو بلبل چہک رہے ہیں۔ خاندان کے نوجوان رشید، حمید، سعید، جدید وغیرہم حاشیہ نشین ہوتے تھے۔ اور اس دعوت علمی سے ذخیرۂ معلومات لے کر اٹھتے تھے۔

نقل | جناب حمید مرحوم فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعرات کو جناب نانا صاحب (یعنی جناب انیس) حسب معمول تشریف لائے۔ جناب دادا صاحب (یعنی جناب انس) سے گفتگو ہونے لگی۔ اثنائے کلام میں دادا صاحب نے جرأت مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ع

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی * وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے ادھر باندھے

نانا صاحب نے بہت تعریف کی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لیجا کے اور چار دن انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک وہ ری حرکت دے کے دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا۔ کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ واقعی میر صاحب پڑھتے کیا تھے شعر کی تصویر کھینچتے تھے +

معاشرت | جناب انس کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ جب نواب ملکہ جہاں (زوجہ محمد علی شاہ)

کربلائے معلّٰی جانے لگیں تو جناب احمد میرزا صاحب صابر اپنے والد کے عہدہ کے ذمہ دار ہوئے۔ چند دنوں کے بعد جب میر اُنس کا انتقال ہوگیا۔ تو یہی مختار عام ہوگئے اور پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوئے۔

واجد علی شاہ اور جناب صابر

عہد واجد علی شاہ میں جناب صابر شاہی ملازم تھے یعنی مجرائیوں میں اسم تھا۔ میر صاحب کی شرافت و دیانت ذاتی نے اس قدر بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی تھی کہ اُنھوں نے آخر کار اپنی بی بی زہرہ محل کے یہاں کی داروغگی اُن کے سپرد کر دی تھی۔

ایک روز جناب صابر دربار میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا "تم محمد میرزا اُنس کے صاحبزادہ ہو" انھیں نے جواب میں عرض کیا "جانِ عالم ہاں" بادشاہ نے فرمایا "تم آئندہ اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح لیا کرو" بنا بر حکمِ ہمایون۔ جناب صابر نے چند غزلیں شاہ کو دکھائیں۔

یہ زمانہ لکھنؤ کی بہار کا تھا۔ ہر شخص بے فکر ہر طرف سامانِ عیش و طرب موجود۔ گلزار ارم سے خوش آیند نغموں کی صدائیں اُٹھ اُٹھ کے تمام خوش اوقات حلقوں میں اپنا دل کش اثر پھیلا چکی تھیں۔ اور الناس علیٰ دین ملوکھم کا مفاد صرف بامحل تک پہنچ چکا تھا۔ ایسے مقامات پر جناب شعر کو جیسا رسوخ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ فطرت سے لکھنو والے مجبور تھے۔ ورنہ اُس وقت کا ذوقِ شعر گوئی تو یہ کہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو سارا لکھنؤ نظم میں باتیں کیا کرتا۔

زہرہ محل کو داروغہ کیا عطا ہوا تھا۔ ایک شاعر واجد علی شاہ کی طرف سے ملا تھا کہ زہرہ محل کی جانب سے نظماً چھیڑ چھاڑ ہوا کرے۔ اور اس طریقہ سے لطفِ محبت جانبین حاصل ہو۔ چنانچہ جب جانِ عالم کی عدم تشریف آوری کو دو چار روز کا عرصہ گذر جایا کرتا تھا

تو زہرہ محل کی طرف سے ایک محبت نامہ (شکایت نامہ معشوقانہ) نظم ہو کر جایا کرتا تھا۔ جو جناب صابر نظم کیا کرتے تھے مقدر مکتوب الیہ کو معلوم تھا کہ صابر نظم کرتے ہیں۔ لہذا تبرکاً اُس پر اصلاح بھی دے دیتے تھے +

جب ۵ - رجب ۱۲۸۲ھ میں واجد علی شاہ کو سرکار کمپنی نے کلکتہ روانہ کر دیا تو لکھنؤ میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ حتہ سلین شاہی کی حالتوں کا تغیر اور ملازمین بندگان عالی کا تفکر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ صرف یہ کافی ہے کہ لکھنؤ کی روش فضا میں تاریکی پھیل گئی۔ عیش و عشرت کے ستارے دُھندلے ہو گئے۔ فراغت کا چاند غروب ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلا گیا۔ واجد علی شاہ کے خاص وابستگان دولت اُن کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ (فقیر اشہر کے یہ نانا میر اسعادت خاں داروغہ چاندی خانۂ شاہی بھی ہمرکاب پادشاہ رہے اور ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کلکتہ ہی میں انتقال کیا) +

قناعت | اس مقام پر مجھ کو یہ ضرورت ہوئی کہ جناب صابر کی قناعت کے متعلق کچھ لکھوں کیونکہ یہ وقت اُن کے لیے بہت سخت تھا۔ واجد علی شاہ سے شفیق آقا سے جدائی ہو چکی تھی غدر کی ہندسوز آگ نے بڑے بڑے خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ تو خاص مرکز تباہی تھے۔ رؤسائے باقماندہ کے پاس اس قدر سرمایہ خود نہ رہا تھا کہ اپنی ہی آبرو قائم رکھتے۔ اور جن کے پاس تھا اُن سے کسی کو چنداں امید پرورش نہ تھی +

جناب صابر کسی کے پاس نہ گئے۔ میر انیس مغفور یا اُن کے والد ماجد میر اُنس مرحوم جو ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ اُسی پر بسر اوقات تھی۔ اُن کو حالت عسرت میں دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ آپ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ جواب دیا حسب دل خواہ قدر دانوں کو کہاں سے لاؤں

ملازمت | بہت دنوں کے بعد نواب ملکہ جہاں کے یہاں اس وجہ سے سلسلہ ہو گیا تھا

کہ خود اُن کے والد بیگم صاحبہ کے نمک خوار تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس ملازمت کو قبول نہ کرتے تو گویا جناب اُنس کی نافرمانی تھی جس کو صابر ایسا صاحب استعداد اور فرماں بردار فرزند کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

صابر کلکتہ واجد علی شاہ معزول

ملکہ جہاں کی عدم موجودگی میں بس دیانتداری سے جناب صابر نے کام کیا تھا اُس کے صلہ میں علاوہ اعتراف خدمت کے کافی صلہ بھی ملا تھا جس وقت ملکہ جہاں سفر عراق سے واپس آئیں تو کچھ تبرکات (جیسا عام قاعدہ ہے) اپنے ہمراہ لائیں۔ اور چاہا کہ واجد علی شاہ کے پاس بھی تحفۃً کچھ تبرک بھیجا جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کس کے ہاتھ بھیجا جائے؟ یا تو جناب اُنس خود لے جائیں یا چھوٹے داروغہ صاحب (جناب صابر) کو یہ خدمت سپرد ہو۔ ملکہ جہاں نے یہ طے کیا کہ آخر الذکر کو یہ سربلندی بخشی جائے۔ چنانچہ جناب صابر تبرکات لیکے کلکتہ پہنچے۔ اُس زمانہ میں بادشاہ نقار خانہ واقع مٹیا برج میں تشریف فرما تھے۔ جناب صابر در دولت پر حاضر ہوئے چوب دار شاہی نے باادب عرض کیا: ظل اللہ فرستادۂ نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ حاضر ہے۔" ارشاد ہوا: بلالو۔" جناب صابر دربار میں گئے۔ مجرا بجالائے۔ فرمایا: "بیٹھو۔" پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور فرمایا: "تم تو ہمارے نوکر تھے۔" جناب صابر نے عرض کیا: "جی جہاں پناہ۔" پھر فرمایا: "تم تو بالکل بڈھے ہو گئے۔" عرض کی: "جب حضور سا آقا نہ رہا تو جوانی کہاں۔" اس عقیدت آمیز جواب نے شاہ کے دل پر اثر کیا۔ گردن جھکالی اور کئی منٹ تک خاموشی کا عالم طاری رہا۔

اسکول اور اُلمپن

اس فقرہ نے واجد علی شاہ کے سامنے اُن کی عظمت کا پرانا نقشہ پیش کر دیا۔ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لکھنؤ ہے اور قیصر باغ کی بارہ دری پیچ منزل

یا گلزارِ ارم میں دربار گرم ہے۔ حاشیہ نشین اپنے اپنے اعزاز و مناصب کے مطابق شاہی مسند کے دونو پہلوؤں پر بیٹھے ہیں۔ درِ دولت کے پردوں سے اطمینان کی ہوائیں آ رہی ہیں شغل سور و سرور جاری ہے۔ کہ ریزیڈنٹ یکایک دربار میں داخل ہوتا ہے اور کرنج کی سلامی دے کے ایک شقہ سرکار کمپنی پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طویل عبارت نظر آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"معاہدہ ۱۸۰۱ء کی پابندی آپ سے نہ ہو سکی۔ لہذا انتظام سلطنت اودھ خود کمپنی کرے گی۔ آپ کو اگر کچھ بطور عذر کہنا ہو تو کلکتہ پہنچ کر گورنر جنرل سے کہہ سکتے ہیں"

چہرہ کے مختلف تغیرات اور ایک عرصہ کے معنی خیز سکوت کے بعد اب پادشاہ نے گردن اٹھائی۔ اور جناب صابر سے پوچھا "اب بھی کچھ کہتے ہو" عرض کیا "بالکل" چھوڑ دیا" فرمایا "کیوں" عرض کیا "حضور کے تشریف لانے کے بعد جی نہ چاہا" جس کا جواب یہ ملا کہ جناب صابر مشقِ سخن جاری رکھیں اور اصلاح کے لیے کلکتہ بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد تبرکات کے حاضر کیے جانے کا حکم ہوا۔ تبرکات کے خوان پیش کیے گئے۔ بہت خوش ہوئے دُرِ نجف کی تسبیح کو اٹھا کے آنکھوں سے لگایا جناب صابر کو ایک بیش قیمت دوشالہ اور ایک رومال عطا ہوا +

عبادت | یہ معمول تھا کہ جناب صابر بلا ناغہ تین بجے رات سے اٹھتے تھے۔ اور بعد نماز صبح تلاوت قرآن مجید اور وظائف میں آٹھ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ خدا پرستی جیسی قناعت کے وسیع میدان میں ہو سکتی ہے۔ دولت کے بندے اکثر اس سے نابلد ہیں +

جناب صابر نے ۲۱ شوال روز چہار شنبہ ۱۳۱۱ھ بہتر سال کی عمر پاکر جانب ملکِ بقا رحلت کی +

مؤلف نے یہاں تک رشید کی دادھیال کے حالات لکھے۔ لہذا اب مختصراً نانہالی خاندان کو بھی بیان کر دیا جائے اگرچہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ رشید میر انیس کے نامی نواسہ ہیں۔ لیکن بہ مزید احتیاط کچھ نانہالی سلسلہ بھی حوالہ قلم کیا جاتا ہے

رشید کی نانہال

رشید کے نانا ناخدائے سخن میر مہر علی انیس مغفور۔ بن میر مستحسن خلیق۔ بن میر حسن دہلوی تھے۔ جن کی مثنوی اور کلیات مشہورِ آفاق ہیں۔

میر حسن مرحوم نے اپنا خاندانی سلسلہ اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے لہذا مختصراً (واقعات انیس سے لے کر) یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ معتبر تحریر اس سلسلہ میں دوسری ممکن نہیں۔ وہ عبارت یہ ہے۔

"اما بعد بر سخن دانانِ شاطر و دانشورانِ ماہر مخفی نماند کہ اصل ایں مؤلف (میر حسن) ابن میر غلام حسین بن میر عزیز اللہ بن میر ہدایت اللہ بن میر امامی موسوی از شاہجہاں آباد است۔ میر امامی موسوی در وقت شاہجہاں از ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردید۔ فاضل متبحر و فقیہ بے مثل بودند گاہ گاہ بجہت تفریح طبع فکر شعر ہم می نمودند۔ پس ایں عاجز سخن را شاعری اجداد میت نہ امروزی و قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالے با این ہمہ قدرتِ علم چون طبع سامعان در خور سمع بلند نیافتند۔ بقدر حوصلہ آنفا بطرف ہزل توسنِ قلم راندند۔ بحکم آنکہ

حصرت رشده

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" (رشید کو میر حسن علیہ الرحمہ سے منسوب کرنے کو اتنی عبارت کافی ہے۔)

رشید کی سسرال

جناب رشید کا عقد میر عسکری صاحب مرحوم کی دختر سے ہوا تھا۔ جو انیس مغفور کے منجھلے بیٹے تھے۔ اور اپنے والد ماجد ہی کے ساتھ رہتے تھے شعر و سخن سے کم دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے غیر معروف ہیں۔

پیارے صاحب رشید

نام و سال ولادت

آپ کا نام سید مصطفیٰ میرزا تھا۔ فرماتے تھے "سال جلوس واجد علی شاہ میرا سال عید الشمس ہے" چونکہ تاریخ جلوس واجد علی شاہ روز دوشنبہ ۲۹ صفر ۱۲۲۳ھ ہے۔ لہذا یہی رشید کا سن ولادت ہے۔ صغر سنی میں خاندان کے بزرگ افراط محبت سے پیارے پیارے کہا کرتے تھے۔ اس لیے یہ عرف ہو گیا۔ کیا تعجب ہے کہ یہ لفظ پہلے میر انیس کی زبان سے نکلی ہو۔ اور انھیں کے اتباع میں اور لوگ بھی کہنے لگے ہوں۔ انیس کے تمام نواسے اور نواسیوں۔ اور پوتے پوتیوں میں رشید سب سے بڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ پہلی اولاد کو انسان کس قدر محبت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

آپ کے والد ماجد کا نام سید احمد میرزا صاحب، بن سید محمد میرزا انس، بن سید علی میرزا، بن سید ذوالفقار علی میرزا ہے۔ اسی طرح سلسلۂ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

حلیہ، قد لانبا، بدن چھریرا کھڑا نقشہ، ماتھا بلند، سونواں ناک، آنکھیں متوسط، پتلی میں کسی قدر نیلاہٹ، ہونٹ پتلے، رنگت گوری لیکن سُرخی غالب ہونے کی وجہ سے تیز گندمی، ناک کہا جا سکتا ہے۔ چہرہ پر بہت متانت تھی۔ داڑھی خشخشی سر پر پٹے +

یہ حلیہ جناب رشید کی پیری کا ہے۔ اس سے اگر اُن کی حالتِ جوانی کا اندازہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ جوان خوش گل ہونگے۔ خود فرماتے تھے:۔ کہ جب غدر کی پریشانیوں کے باعث سے۔ میرا نیس میرزا عباس صاحب کے مکان واقع منصور نگر میں۔ مع اہل و عیال چلے گئے تھے۔ تو میں بھی ساتھ تھا۔ بلوائیوں کی لوٹ مار جاری تھی۔ خاندان کے تمام مرد۔ اوقاتِ مقررہ پر روز و شب باری باری پہرہ دیتے تھے۔ میری کمر میں بھی سبز منڈی کی بندھی ہوئی تھی"۔ خلاصہ یہ کہ رشید بھی کبھی لکھنؤ کے بانکے جوان ہونگے +

وضع لباس | آخر عمر کی وضع بالکل سادی تھی مہین تنزیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اُس کے نیچے کرتہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی چھالٹین کا شلوکہ گھٹنیوں تک کا پہن لیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپی چکن کے کام کی پہنتے تھے۔ پنج گوشیہ ٹوپی جو اکثر مرثیہ خواں پہنتے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں پہنی۔ یہی دو پلڑی ٹوپی اُن کا خاندان بھر پہنتا ہے۔ اب تک انیس کے خاندان والے پنج گوشیہ ٹوپی پہن کر زیب ممبر ہوتے تھے۔ اور عشق کے خاندانی دو پلڑی ٹوپی پہن کے۔ یہی امتیازی فرق سر ممبر خاندانی سلسلہ ظاہر کرتا تھا۔ (لیکن سوائے بڈھوں کے پنج گوشیہ ٹوپی کا رواج اُٹھ گیا) رشید نے جوانی میں بھی مُنڈا نہیں پہنا۔ کلی دار پائجامہ

پہنتے تھے۔ جب زیبِ منبر ہوتے تھے۔ تو ایک بڑا رومال دو لو زانوؤں پر ڈال لیتے تھے۔ جس کو تہذیب سمجھ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

استعداد علمی | یوں تو جناب رشید نے بہت سے باکمالوں سے درس لیا ہے۔ لیکن یہ چند حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی سید اصغر شاہ صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا میرزا محمد صاحب اخباری سے جو لکھنؤ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ فقہ کی کتابیں ختم کیں۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد نقی صاحب نے جناب رشید سے سوال کیا "آپ نے اصولِ فقہ اُن سے نہیں پڑھے" ہنس کے فرمایا "اصول فقہ سے اُن کو کیا علاقہ تھا" (اُستاد کے عقائد کا اثر شاگرد پر ضرور پڑتا ہے۔ اگرچہ کافی اثر نہ ہو تو کم از کم اُس کے خیالات کی وقعت ضرور ہوتی ہے) منطق و فلسفہ مولوی انور علی صاحب حنفی سے پڑھا تھا۔ خلاصہ یہ کہ عربی کے درسیات کل نکلے ہوئے تھے۔ فارسی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے تھے۔

رشید کو رمل میں بھی کچھ دستگاہ تھی۔ اکثر لوگ دریافت حال کرنے آتے تھے۔ مگر پیرانہ سالی میں انکار کر دیتے تھے۔ تاہم اب بھی عالی الصبح عورتیں اپنے بچوں کو لیے ہوئے آتی تھیں۔ اور اُن سے مختلف امراض کے تعویذ لے جایا کرتی تھیں خصوصاً اگر کوئی مریض گرمل میں مبتلا ہوتا تھا۔ تو جناب رشید کا صرف تین روز پڑھ کر گلے پر ہاتھ پھیر دینا شفا بخشتا تھا۔ اُن کے بعد گرمل کی شکایت رکھنے والے حمید و سعید کے پاس آتے تھے۔ اور شفا پاتے تھے۔ رشید کی استعداد علمی کی تائید میں ذیل کی دو سطریں جناب محشر کی زبانی نقل کی جاتی ہیں۔

میر وزیر علی اخگر مرحوم ساکن گولا گنج لکھنؤ رشید کے بے تکلف اور
ہم سن دوست تھے دوران گفتگو میں ایک روز جناب محشر سے فرمانے
لگے "لکھنؤ کے لوگ رشید کی استعداد علمی میں شک کرتے ہیں۔ بھائی
یہ بالکل غلط ہے۔ میں اور رشید شمس بازغہ ساتھ پڑھتے تھے"

فقیر مؤلف اکثر خدمت رشید میں جایا کرتا تھا۔ بیشتر نماز مغرب کے وقت اپنے
دادا کی مسجد میں ملا کرتے تھے۔ ایک روز میں حاضر تھا۔ اتفاق سے ایک بلوچی سائل
مسجد کے دروازہ پر آکر سوال کیا "برائے خدا چیزے بدہید"۔ رشید نے اُس سے
فارسی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے
اور فرمایا "فارسی بڑی میٹھی زبان ہے"۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے جناب مولانا محمد حسین
صاحب قبلہ علامہ ہندی مرحوم سے عربی میں باتیں کرتے سنا تھا مجھ کو اُس وقت تک
علم نہ تھا کہ رشید عربی بھی پڑھے ہیں۔ میں نے استعجاباً مولانا مرحوم سے پوچھا
کیا رشید عربی بھی پڑھے ہیں؟ فرمایا "وہ کیا نہیں پڑھے ہیں"

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم باقر حسین صاحب مرحوم اور مولوی سید جواد صاحب
رشید کے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔

اخلاق و مزاج رشید کا خلق بہت وسیع تھا جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج زمانہ
مداح ہے۔ چونکہ وہ فقیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکتا تھا دوسرے
کے احساسات کو صدمہ نہیں پہنچاتے تھے۔ کسی سے اگر ایک دفعہ ملاقات ہو گئی اُس
کے بعد جب کبھی اُس سے ملاقات ہوتی وہی تپاک وہی اخلاق۔ کیوں نہ ہو پرانے
زمانہ کے ممتاز آزاد کا جنس اُٹھا چکے تھے۔ بلکہ خود بھی انھیں کا ایک آخری جزو

مصور کیے جاتے تھے۔ اگر وہ پابندی وضع نہ کرتے تو اور کون کرتا +

نقل

جس زمانہ میں جناب محشر کا قیام کوچۂ شاہ چھپڑا میں تھا۔ یہ سخت بیمار ہوئے اور جس روز بعد صحت گھر سے باہر نکلے اُسی روز اُن کی عدم موجودگی میں جناب رشید عیادت کو تشریف لائے۔ جناب محشر گھر میں کہاں تھے جو ملتے۔ رشید نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی حادثہ نے پنسل کا حد حاصر کیا۔ اُس سے فرمایا "تو اہم لوگ اکلے وقت کے ہیں۔ ابھی تک نہ پنسل سے لکھا ہے نہ لکھا آتا ہے۔ قلم دوات لاؤ" غرض کہ قلم دوات آئی۔ اور رشید یہ شعر لکھ کر واپس گئے۔

رکاب گنج سے مشتاق دید آیا تھا
ملے نہ حضرت محشر رشید آیا تھا

"جناب عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ میں اپنی بدبختی سے بہت کم اُن کی خدمت میں جاتا تھا۔ مگر جب ملاقات ہوتی تھی۔ تو یگانگی و محبت اُن کے لفظ لفظ سے ٹپکتی تھی مجالس میں جب مرثیہ معروف مرثیہ خوانی ہوتے تھے اور مجلس پر نظر پڑ جاتی تھی۔ تو اکثر مرثیہ روک کر اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ اور یہ اُنکی عزت افزائی تھی۔ تواضع کا انکسار اور تفہیم نفس اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض وقت اُن کے چھوٹوں کو یہ دھوکا ہوتا تھا کہ یہ ہمیں بنانے تو نہیں ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا"

اوقات ملاقات | رشید کی ملاقات کا یہ طریقہ تھا۔ اگر کوئی اوقات ملاقات کے وقت پہنچا تو مسجد میں ملتے تھے۔ اور چائی بھجوا دیتے تھے۔ اور یہاں کے ساتھ خود بھی بیٹھ جاتے تھے۔ باتیں کرنے لگتے تھے۔ سننے والا اس بلبل قند مقال کی نواسنجیوں سے مست ہو جاتا تھا

اگر کوئی اوقاتِ نماز کے علاوہ کسی وقت پہنچا۔ تو امام باڑہ کے مشرقی کمرہ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ جہاں صرف اتنا سامان تکلف نظر آتا تھا۔ کہ ایک سفید فرش ہوتا تھا اور سیاہ اگر جاڑوں کا زمانہ ہوا تو روئی دار کنٹوپ اور دگلا۔ اگر گرمیاں ہوئیں تو ایک کرتہ اور لنگی باندھے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اللہ

(سادگی سے پرہیز) اکثر اعزّا و احباب نے کہا۔ آج کل ہر شخص شان ظاہری کا پابند ہے۔ اور بغیر اُس کے چارہ نہیں۔ آپ کے پاس معززین آتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک کمرہ مع سامان علیحدہ ہونا چاہیے۔ جس سے اُن کی نگاہوں میں آپ کی وقعت اور زیادہ ہو۔ جواب دیا "بس یہی ٹھیک ہے رشید بدل نہیں سکتا"۔

(نازک مزاجی اور اہلِ کمال) آخری وقت میں بہت نازک مزاج ہو گئے تھے۔ اول تو پیرانہ سالی۔ دوسرے دُنیائے مرثیہ گوئی کے چند ناگوار و ناگفتہ بہ واقعات ایسے گذرے جنہوں نے رشید کو زُود رنج بنا دیا تھا۔ اگرچہ کمال کے لیے نازک مزاجی لازم ہے۔ لیکن ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد۔

یہ ضرور ہے کہ ایک کامل شخص جو دُنیا کو اچھی طرح دیکھ چکا ہو۔ اُس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہی حاصل کر چکا ہو۔ شہرت کی آخری حد تک پہنچ چکا ہو اُس کی طبیعت میں ایک قسم کا استغنا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے عوام کی نظر غرور مراد لیتی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا وہ تمدنی نقطہ نظر سے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے پر فطرتاً مجبور ہوتا ہے مگر اُس کا طرزِ عمل خودداری اور بے پروائی کے نمایاں رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اخلاق ایک جوہرِ انسانی ہے۔ یا وہ زیور ہے جس کے سوا کسی دوسری چیز سے انسان کی

آراستگی غیر ممکن۔ دُنیا کا کوئی مذہب اخلاقی مواعظ کی تلقین سے خالی نظر نہیں آتا۔ اور مذہب اسلام کی تو بنیاد ہی اخلاق پر ہے۔

میری رائے میں کسی کو کیسا ہی کمال کیوں نہ ہو۔ مگر اُس کو اپنے اخلاق کو نہ بگاڑنا چاہیے۔ اظہارِ اخلاق کا قدرتی آلہ زبان ہے۔ لہٰذا دوسرے سے جب گفتگو کی جائے تو ایسے الفاظ میں جن سے حدود اخلاق کا پتہ چلے۔

سالانہ آمد واقعہ | مؤلف واقعات انیس نے صفحہ ۱۰۴ پر انیس مغفور کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے۔ جو مختصراً درج ذیل ہے۔

خود انیس مغفور نے ایک زمانہ تک لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد چند مجبوریوں سے حسینیہ افضل محل مرحومہ میں ایک مجلس پڑھی۔ جو مرثیہ پڑھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

لوگوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ اس مرثیہ کا نصف حصہ میر صاحب نے ایک شب میں تصنیف کیا تھا۔ اتفاقاً اسی سلسلہ میں انیس کی زُود گوئی کا ذکر نواب محمد امین خاں صاحب مرحوم کی صحبت میں بھی آگیا جس میں میر نواب صاحب مونس بھی موجود تھے انھوں نے اپنے جادو نگار بھائی کی عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا "مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ حیرت انگیز بات نہیں ہے"

لوگوں نے یہ واقعہ انیس کے گوش گزار کیا اور نہ معلوم کن الفاظ میں کہ انیس ناراض ہو گئے۔

بالمختصر۔ مونس مرحوم جب اپنا مرثیہ اصلاح لینے کے لیے انیس کے پاس حاضر ہوئے

جس کا مطلع یہ ہے۔ (نہ معلوم اصلی مرثیہ کا یہی مطلع تھا یا کچھ اور)

"بعض اشعار ہی مذکورِ وفاداری خسرو"

میر انیس اُس وقت حوض میں نہا رہے تھے۔ مونس کی صورت دیکھ کے کچھ یاد آگیا۔ فرمایا پڑھو۔ سُنتے رہے۔ اور جب مرثیہ ختم ہوا۔ تو ایک دفعہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے سیاہ ورقوں کو حوض کے شفاف پانی میں سفید کر دیا۔ اب حوض سے نکلے اور مونس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے گھر پہنچے۔ اور جناب مونس کو وہ فقرہ یاد دلایا۔ جو اُنھوں نے نواب محمد حسین خاں صاحب کی محل میں کہا تھا۔ اور غصہ میں کہا۔

"میر نواب یاد رکھنا اگر تمہاری تعلیوں کی بھی کیفیت رہی تو خورشید علی کی جوتیاں ہونگی اور تمہارا سر"

تعاصائے انصاف | میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قابل مؤلف نے۔ انیس کی زود رنجی۔ اور نازک مزاجی کے اظہار کے لیے یہ نقل لکھی ہے۔ یا مونس مرحوم کا اظہارِ سعادت اس سے مقصود ہے بہر حال یہ تو ظاہر ہو گیا کہ انیس مونس نفیس تین فکروں نے مل کر ایک وقت میں ایک مرثیہ تیار کیا۔ اور شاید دوری نقل کا نتیجہ بھی مؤلف کے نزدیک یہی تھا۔ مگر غائر نظر ڈالنے والوں نے۔ اُس سے ایک نتیجہ اور بھی نکالا ہے۔ وہ یہ کہ انیس کے اخلاق۔ اس قدر کمزور تھے۔ کہ نازک مزاجی نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا۔ اوّل تو ایک برابر کا بھائی۔ اور لیا جائے جس کا کمال۔ انیس کے کمال کا ہمسر ہو۔ دوسرے جس کی شخصیت اہلِ علم کی نگاہوں میں ایک پایہ حاصل کر چکی ہو۔ اُس کو انیس ایسا سانی ایسے کروہ الفاظ سے مخاطب کرے۔ اور پھر خلوت میں بھی نہیں۔ بلکہ ایک نوعمر فرزند یعنی نفیس مرحوم کے سامنے۔ یہ فعل انیس کی ناعاقبت اندیشی پر محمول ہو سکتا ہے

اگر نفیس سامعہ شناس فرد ہوتا تو احتمال تھا کہ اپنے ایک بزرگ خاندان کو اپنی آئندہ عمر میں کوتاہ نظری سے دیکھتا۔

علاوہ بریں انیس مرحوم نے اس مرثیہ مشہور میں جس کا مطلع یہ ہے

"کب حوان تکلم ہے فصاحت سے بری"

تفاخر شاعرانہ کرتے ہوئے اپنے اعزا کے باکمال کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مونس مغفور کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

بھائی وہ مونس خوش لہجہ و پاکیزہ خیال — جس کا سینہ ہے علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال — معجزہ گر نہ اسے کہیئے تو ہے سحر حلال

اپنے موقع پہ نہ دیکھیے لاثانی ہے
لطف صحبت کا ہے رحمت کا ہے بانی ہے

طبع سلیم اس واقعہ کو ہرگز نہیں تسلیم کرسکتی۔ اصحاب تہذیب سے یہ امر بالکل بعید ہے۔ بفرض محال اگر انیس نے ایسا کہا بھی تھا۔ تو اس واقعہ کو پبلک میں پیش کرنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ یہ واقعہ اُن انسانی کمزوریوں کی شق میں آتا ہے جو کسی فرد کامل کے اعلیٰ زندگی کے وقت قلم کو نظر انداز کرنا چاہیے۔

مذہب | بعض تذکرہ نویسوں نے نہیں معلوم شاعروں کے مذہب سے کیوں بحث نہیں کی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں نے اس میں کیا مصلحت سمجھی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب مولانا شبلی مرحوم پر ہے۔ جو اس دور جدید کے مشہور انشا پردازوں میں سے تھے۔ اور زیادہ تر تحریر سے اُن کے قلم کو خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے بھی شعر العجم میں شاعر کے مذہب سے بحث نہیں کی۔ البتہ شاذ کسی کے عقائد کو مجملاً

بیان کر دیا ہے۔

بہرحال جس شخص کے حالات تصریحاً لکھے جائیں۔ اُس کے مذہب پر بھی پوری روشنی ڈالنی چاہیے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اُس کے متعلق تاریکی میں نہ رہیں۔ اور قلمی فساد پیدا نہ ہو۔ مولوی الطاف حسین حالی مرحوم نے غالب کے باب میں کس قدر کھینچ تان کر تفضیلیہ ثابت کر دیا۔ اگرچہ تھوڑی دیر کو فرض کر لیا جائے کہ غالب سنی تھے تو مذہب تشیع میں کونسا ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اگر شیعہ تھے تو مذہب سنن میں کونسی کمزوری آئی جاتی ہے۔ بہرحال غالب شیعہ تھے۔

جناب صفیر بلگرامی۔ شاگرد جناب غالب۔ و مرزا دبیر و ستھر لکھنوی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔ (میں پوری عبارت نقل نہ کروں گا بلکہ مناسب مقام)

"بندہ ۱۲۸۳ھ میں اپنے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا ذکر آیا۔ نانا صاحب سے اور اُن سے ایک خاص ربط تھا۔ میں نے خواہش کی کہ غالب کا شاگرد ہوں۔ نانا صاحب نے ایک عریضہ مع دو غزلوں کے ارسال خدمت غالب کیا۔ ۱۲۸۴ھ میں حضرت غالب کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ آرہ سے مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ بلی ماروں کے محلہ میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ مجھ کو پوچھا یہ کون ہیں۔ میرے ماموں نے کہا "صفیر آپ کے شاگرد" اتنے میں نواب ضیاء الدین خان صاحب تشریف لائے۔ اور دوسری باتیں چھڑ گئیں"

ہم کو اور ماموں صاحب کو نواب صاحب موصوف کے مکان میں
قیام کی جگہ ملی۔ جو مسجد جامع کے متصل تھا۔ ایک دن ہم اور ماموں صاحب
اور چند دوسرے حضرات غالب کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔
اثنائے کلام میں ایک صاحب نے میرے مذہب کو دریافت کیا۔
غالب نے میرے ماموں کی طرف اشارہ کر کے کہا مِنھُم اور میری
جانب اشارہ کر کے کہا مِنّا۔ یعنی میرے ماموں کو کہا کہ سُنّی ہیں۔
اور مجھ کو کہا کہ یہ ہم میں سے ہیں یعنی شیعہ ہیں۔"

دیکھیے حافظ شیرازی کی نسبت کیسا جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ شیعی کہتے ہیں شیعہ تھے۔ اور
اُن کا قصیدہ اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں اہلِ تسنن انھیں سُنّی کہتے ہیں،
اور قصیدہ کو الحاقی بتاتے ہیں۔

محقق دوانی کی نسبت بھی یہی جھگڑا ہے۔ شیعہ اُن کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ آخر زمانہ
میں وہ شیعہ ہو گئے تھے۔ اور رسالۂ نور الہدایہ علامہ دوانی کو حجت میں پیش کرتے
ہیں۔ غرضہ کہ اگر مذہب تحقیق کر کے لکھا جائے تو اکثر ناموں میں اس قسم کا
جھگڑا پیدا ہو۔

بہرحال جناب رشید کا مذہب شیعہ تھا۔ لیکن تعصب مذہبی اُن کو مطلق
نہ تھا۔ اُن کے تمام مراثی اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ سُنّی و شیعہ کے مابہ النزاع
مسائل کا اُن کے کسی مصنف کے کلام میں ذرا ذکر نہیں۔ حیدرآباد۔ پٹنہ۔ کلکتہ اور
لکھنؤ کی مجالس میں ایک معتد بہ تعداد اہلِ سُنّت کی ہوتی تھی۔ مگر کبھی کسی نے مرثیہ کے
کسی حصّہ میں کوئی مقام اپنے اعتقاد کے خلاف نہ پایا۔

ظاہر ہے کہ صنفِ سخن میں مرثیہ وہ صنف ہے جس میں سوائے حالات متعلقہ کے کسی دوسرے مضمون کی گنجائش ہی نہیں۔ قادر الکلامی کے تو یہی معنی ہیں کہ شاعر جس صنف کو اختیار کرے۔ اُس کے دائرے سے آگے قدم نہ نکالے +

مرثیہ کا میدان اوّل تو یوں ہی وسیع ہے۔ دوسرے یہ کہ فضائل و حالات شہدائے کربلا اس قدر وسیع ہیں کہ آج تک لکھے جاتے ہیں۔ اور ختم نہیں ہوتے۔

اسی طرح انیس و دبیر نے بھی مذہبی مسائل سے اپنے مراثی میں گریز کی ہے چنانچہ ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں مکرمی جناب نواب بن صاحب بلیغ کے مکان پر وقتِ افطار میں بھی موجود تھا۔ ایک صاحب ضعیف العمر مرزا احمد جعفر صاحب بھی موجود تھے جو مرزا دبیر مغفور کے ساگرد ہیں اور جن کے پاس اُن مرحوم کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہے۔ اثنائے کلام میں مرزا دبیر مغفور کا ذکر نکل آیا۔ اور اتفاق سے مرثیہ کے اُس طرز پر گفتگو ہونے لگی۔ جس سے کسی گروہ کی دلشکنی ہو مرزا صاحب موصوف نے بیان کیا۔ کہ پٹنہ میں ایک دفعہ دبیر مغفور سے لوگوں نے اصرار کیا۔ کہ کچھ رباعیات خلاف شان مرثیہ نظم کریں اور پڑھیں۔ اول تو مرزا صاحب نے بہت انکار کیا۔ مگر جب لوگوں نے نہ مانا تو ناچار دو رباعیاں کہیں۔ جن کے چوتھے مصرعہ میں نعمت خاں عالی کے دو قطعوں کے آخری مصرعوں کا بعینہٖ ترجمہ کر دیا ہے۔

مشہور ہے کہ عالمگیر کے بارہا استفسارِ مذہب پر نعمت خاں عالی نے جو اُنہیں دیا تھا۔ اُن قطعات کے مطلب میں دو دو پہلو ہیں۔ اگر چار کی تکرار کو متعدد زور دیا جائے تو مذہبِ سُنّی کی پیروی معلوم ہوتی ہے۔ اگر چار کو تین سے ضرب دے کے جمع کریں تو مذہبِ اثنا عشری کا ماننا ثابت ہوتا ہے۔ ذیل میں عالی اور دبیر دونوں کے

اشعار پیش کش ہیں۔

عالی

بارہا گفتم بتو اے شہریار — چار یارم۔ چار یارم۔ چار یار

مرزا دبیر

گو قائلِ چار یار اغیار ہوئے — ہم اُن کے شریک چار و ناچار ہوئے
پوچھیں جو نبی کے جانشینوں کو دبیر — کہہ چار ہوئے چار ہوئے چار ہوئے

عالی

اصحابِ نبی کہ چار یار ند — چوں چار کتاب در شمار ند
در پاکیِ شاں شکے نہ رہے — زاں چار یکے نداشت عیبے

دبیر

افضل ہیں نبی کے یار سب یاروں میں — چیدہ ہیں یہ یار لاکھ دیداروں میں
کچھ اس میں شش و پنج نہیں ہم کو دبیر — اک طاسِ دُنبالہ نہیں ان چاروں میں

یہ رباعیاں مثالاً اس وجہ سے لکھ دی گئیں کہ ان میں کوئی امر خلافِ مذہب نہیں ہے جو کسی کو ناگوار گذرے۔ چونکہ اس میں رکھا گیا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور دُنبالہ مذہب اثنا عشری کے عقائد کو جاتی ہے۔ بہر حال رباعیات پُر لطف ہیں بہیئت کلام۔

سرِ ورق تحریر رشید کی گفتگو کا طریقہ نہایت دلچسپ تھا۔ اول تو اُن کی سلیس زبان دوسرے نرم لہجہ۔ یہ دونو باتیں ایسی تھیں جو سُننے والے کو محو کر دیتی تھیں۔ جواب نہایت نرم اور مختصر الفاظ میں دیتے تھے۔ جب مولوی محمد علی صاحب شاداں سے اُن کے حالات قلمبند کرنا شروع کیے تو دوسرے تیسرے دن کا سبق بھی جاتا رہا تھا اور خود جناب رشید یا جنابِ حمید سے استفسارِ حالات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

مولوی صاحب موصوف نے جناب رشید سے اُن کے کلام کے انتخاب کے بارہ میں گفتگو چھیڑ دی۔ اور کہا کہ فلاں مرثیہ دیجیے۔ اور فلاں سلام دیجیے اور ہاں وہ رباعیات بھی مرحمت فرمایئے جو حضور نظام کی مدح میں ہیں۔ اور دیکھیے اپنی رباعیوں کا مجموعہ بھی نکال رکھیے گا۔ بھولیے گا نہیں۔ جناب رشید نے ان سب باتوں کا جواب اس مختصر جملہ سے دیا "بھئی میں اپنا بستہ لائے دیتا ہوں۔ گھر لیتے جاو جو چاہے نکال لینا" لفظ بھئی، تو اُن کی زبان سے ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ گویا انھیں کے لیے وضع ہوئی تھی۔ سر سر بھی جس بند یا سامعین کی زیادہ توجہ چاہتے تھے تو کہتے تھے "بھئی سنو" اور کبھی کبھی کسی مصرعہ کے پہلے اُس کو استعمال کرتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ جزو مصرعہ ہی۔

لطیفہ

شدید گرمیوں میں ایک مرتبہ جناب محشر ملنے گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں مرحوم نے عرق پیشانی رومال سے پاک کیا اور مسکرا کر فرمایا "محشر! دیکھتے کیا ہو پسینہ نہیں، دماغ سے مضامین کا جوہر کھنچ رہا ہے۔ میں نے رومال میں اس وقت حفاظت سے باندھ لیا ہے۔ سب ضرورت نظم ہوگی دیکھا جائے گا"

اگر کسی کو خط لکھنے ہے تو بہت مختصر اور مطلب آمیز ہو

خودداری | جہاں یہ سب تھا وہاں رشید میں صفت خودداری بھی بہت تھی۔ زیادہ خودنمائی اگرچہ کسی حد تک ہو اور وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ دوسروں کی نظروں میں زوال وقعت کا باعث ہو جایا کرتی ہے۔ واضعان قانون تمدن و اخلاق نے جو

اصول تہذیب مجلس کی صف میں قائم کیے ہیں۔ اُن کی پابندی اگر کچھ اور نہیں تو اس کو خود شناسی اور غیر شناسی کے سچے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔ مگر یہ نتیجہ اُس وقت نکلتا ہے جب اصول تہذیب مجلس کی پابندی میں رسم زمانہ یا دکھاوٹ کا شائبہ مطلق نہو۔ کیونکہ جہاں غرضِ اصلی مفقود ہوگی۔ یا بنای تہذیب مضحک ہو جائے گی۔ اور جہاں مدعائے حقیقی مدِ نظر ہوگا۔ روح کو فرحت حاصل ہوگی

جو اصحاب ان اصولوں کے منشاء اصلی سے بیگانہ ہیں وہ اُن کو محض تکلف سمجھ کے ہنستے ہیں۔ مگر وہ حضرات شاید یہ نہیں سوچتے۔ کہ اگر اس تکلف کو درمیان سے نکال دیا جائے تو جو افراد مستحق عزت ہیں اور جو نہیں ہیں وہ دونوں ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں۔ اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فضلاء جہلا امرا وغیر امرا سب ایک ہی برتاؤ کے قابل ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں اس بحث کو طولانی کرنے میں مطلب سے دور نکل جاؤں گا لہذا یہ کہہ کے ختم کرتا ہوں کہ اصولِ تہذیب کی پابندی ہر جہت میں اُس کے رضاؤں کی سچی پیروی ہے۔

اے یورپ کی تہذیب کے دلدادہ نوجوانو اپنے آباؤ اجداد کے اوضاع پر پہلے ایک نظر ڈال لو پھر جو چاہے کرو۔

صفت چوتھی | رشید میرزا چونکہ زاہد گوئی بالکل تھی۔ اس وجہ سے جو کلمہ منہ سے نکلتا تھا۔ مناسب و محل ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک صاحب دولت رشید کے پاس تشریف لائے۔ چونکہ خود بھی شاعر تھے۔ ایک مطلا بیاض ایک مصاحب ساتھ تھی۔ اُن کی تشریف آوری کی غرض رشید کو اپنا کلام سنانا تھا اور بعد رسم ملاقات اُن حضرت نے اجازت رشید سے بیاض کھولی۔

رشید سُننے کے لیے متوجہ ہوئے۔ بیچارہ کی زبان سے یوں مصرعہ بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ مصاحبین نے جو اُن کے ہمراہ تھے ا۔ا۔ا سبحان اللہ کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں۔ اسی طرح وہ حضرت چار پانچ شعر پڑھ گئے۔ رشید صرف گردن ہلاتے رہے مگر ان کی خاموشی کی اُن کو تاب نہ رہی اور کہا۔ جناب آپ کچھ نہیں بولتے۔ فرمایا "حضرت جہاں تعریف کرنے والے موجود ہوں وہاں رشید کے بولنے کا کیا محل" اس پر سب خاموش ہو گئے اور اب رشید نے اُن کے کلام کی برمحل داد دینا شروع کی وہ حضرت بہت خوش ہوئے اور بیاض رشید کے پاس اصلاح کی غرض چھوڑ گئے

رشید اور آلا اودل

رشید کے مکان کی پشت پر ایک وسیع زمین پڑی ہے جس پر کاشت ہوتی ہے۔ اور چند مکان بنے ہیں۔ جن میں مزدوری پیشہ قومیں آباد ہیں۔ لوگ دن بھر کے تھکے ماندے رات کے وقت اپنے اپنے بوریوں میں بے فکری سے اوقات گذاری کرتے ہیں۔ اور اُن کی دوسری دلچسپی کے اشغال میں ایک آلا اودل کا پڑھا جانا بھی ہے چنانچہ حمید مرحوم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ادھر آلا اودل شروع ہوئی اور جناب رشید کھیت کی مینڈھ پر جا بیٹھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات کے دو بجے اُٹھ کر گھر آئے۔ رشید کو اُس سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی کی نظم رزمیہ ہے اور اس قدر سادہ ہے کہ یورپ کی نیچرل شاعری کا جواب دیتی ہے چونکہ رشید کو مرثیہ یا مثنوی میں رزمیہ کا کام پڑتا تھا۔ اس وجہ سے آلا اودل کی واقعہ نگاری اور سادگی بہت پسند آتی تھی۔ اور اُس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

دوسرا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید لکھنؤ میں کہیں مرثیہ پڑھنے جا رہے تھے سکرم کی سواری تھی۔ اتفاق سے سکرم کسی دوسری گاڑی سے لڑ گئی اور گھوڑے بھڑک گئے

بیچارہ اس قدر خائف ہوئے۔ کہ دعائے خوف پڑھنے لگے۔ خدا خدا کرکے جانور دھیمے ہوئے اور رشید کو مقام مقررہ پر پہنچا دیا۔ اُس روز سے آخری دم تک پھر کبھی شکرم پر نہیں بیٹھے پالکی میں جایا کرتے تھے +

بجلی اور رشید | بجلی سے بہت ڈرتے تھے جب آسمان پر تھا دم ابر و باد ہوتا تھا۔ وہ باہر نظر نہ آتے تھے۔ ذرا بھی اگر کوندے کی لپک کے آثار نمایاں ہوئے۔ رشید گھر کے آخری کونے میں جا چھپتے تھے۔ اور رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ اگر کہیں متواتر گڑگڑاہٹ شروع ہو جاتی تھی تو بس پھر غصب کا سامنا تھا۔ کانوں کو ہاتھوں سے بند کر لیتے تھے اور جب تک فضائی فرشتوں کی شورش برطرف نہ ہوتی تھی۔ اُس وقت تک وہ گوشہ ہوتا تھا اور رشید +

تکالیف کا اندازہ انسان کو اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خود بتلا نہ ہو یا کسی دوسرے کو اُن کے سکھ میں عبرت کی نگاہ سے نہ دیکھ لے۔ سُنا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رشید نے کسی برق زدہ شخص کو دیکھ لیا تھا جو کہ بحیثیت شاعر سریع الحس قلب پایا تھا۔ اس لیے جب بجلی چمکتی تھی۔ اُن کو اس سلسلہ میں وہی واقعہ یاد آجاتا تھا +

استسقا | ایک صاحب فیض آباد میں بالکل غریب آدمی تھے وہ جناب رشید کو اپنے یہاں مجالس پڑھوانے کے لیے لے گئے۔ تین مجلسیں انھوں نے پڑھیں۔ وہ بیچارہ مصارف سفر کہیں سے فراہم کرکے رشید کو دینے لگے رشید نے قطعاً انکار کیا۔ دو سال تک اپنے ہی مصارف سے گئے۔ تیسری سال جب انھوں نے بہت ہی مجبور کیا۔ اور ٹکٹ ہی لاکر دے دیا۔ تو رشید نے مجبوراً منظور کیا +

ضلع مظفر نگر میں کھتولی ایک مقام ہے وہاں کے ایک باشندہ سید حافظ علی صاحب

لکھنؤ آئے۔ اور جناب رشید کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید صاحب بارہے کے ایک پُرجوش شیعہ تھے۔ مگر دولت نہ رکھتے تھے۔ رشید کو پڑھوانے کا شوق تھا چہلم کا زمانہ تھا۔ رشید نے چار مجلسیں پڑھیں۔ تمام گرد و نواح کے سادات بارہ جمع ہوتے تھے۔ اور اس مداح خاندان رسالت کو سچی داد دیتے تھے۔

جب مجالس ختم ہوئیں صاحب مجلس نے ایک سو تیس ۱۳۰ روپیہ صرف مصارف آمد و رفت کی حیثیت سے پیش کیے۔ رشید نہیں لیتے تھے۔ مگر انھوں نے باصرار دے ہی دیے۔ رشید کو یہ اصرار ناگوار ہوا۔ اور کئی سال تک نہیں گئے۔ مگر سید صاحب آخر کار اس قدر مصر ہوئے کہ ایک مرتبہ کہنے لگے۔ اگر آپ اب تشریف نہ لے چلیں گے تو امام حسینؑ سے فریاد کروں گا۔ رشید بھر جانے لگے۔ اور صرف مصارف سفر لے لیتے تھے۔ اور بس +

رشید اور انیس | انیس کے زمانہ سے کچھ قبل تک "بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو" کہا جاتا تھا۔ مگر انیس نے اس کی تردید کر دی۔ اور ثابت کر دکھایا۔ کہ لوگوں کا خیال غلط ہے۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کو اس قدر وسعت دی کہ اس صنف کے مجدد کہلائے۔ چنانچہ ایک سلام میں بجا فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

مری قدر کو اے زمین سخن ۔۔۔ تجھے بات میں آسمان کر دیا

غزل کے جو معنی ہیں کہ وصال۔ ہجر۔ امید۔ یاس۔ حسرت وغیرہا کے مضامین ایک مقفیہ قافیہ و ردیف میں کہے جائیں۔ بلکہ یہی مضامین کسی دوسری صنف سخن میں لکھے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اُن کے نظم کرنے والے میں پوری قدرت ہو کہ انھیں دوسرے لباس میں آراستہ کر سکے۔ میں اپنے قول کی تائید میں مولانا شہری مرحوم کی

"مشرقی شاعری" تالیف کا شکر گذار ہوں جس میں اُنھوں نے۔ انیس کے کلام تغزل آمیز کو اُن کے مذہبی کلام مرثیہ، سلام، وغیرہ سے نکال کے جمع کیا ہے۔

انیس کی غزل

رشید کے نانا میر انیس نے دوران مرثیہ گوئی میں غزل گوئی کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ اگرچہ یہ شغل بھی ہر صنف سخن کے مشاق کے لیے ناگزیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں غزلیں بھی کہیں اور بہت کہیں، جن کا مجموعہ اُن کے خاندان میں موجود ہے یہ اشعار انھیں کے ہیں۔

ہوا ہے۔ ابر ہے۔ ساقی ہے۔ مے ہے	مگر تو ہی نہیں یا فصل ہے ہے
لکھ کر دہیں پہ نام ہمارا مٹا دیا	اُن کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
دل لے لیا ہے یار نے مخفی میں جھک کے	کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

لیکن جب سے مرثیہ گوئی میں زیادہ انہماک ہوا اُس وقت سے مشق غزل بالکل ترک کر دی تھی۔ جناب رشید فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میرا عنفوان شباب تھا۔ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ میں نے غزل کہی اور نانا صاحب کے پاس اصلاح کو لے گیا۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

وصل کی شب اُن سے باتوں میں سحر ہو جائے گی،

انیس کی غزل

اُس وقت نانا صاحب قبلہ کو میں نے خلاف معمول خوش مزاج پا کے اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور عرض کی کہ آپ بھی اس طرح میں غزل کہیے۔ میری اس عرض پر مسکرا کے اور گلے سے لگا کے کہا بیٹا مرثیہ گوئی ہماری غزل گوئی ہے اچھا ابکی دفعہ مجلس میں تمھاری دعوتی کریں گے اور غزل پڑھیں گے۔

تھوڑے دنوں کے بعد انیس کے لئے مرثیہ کا رمضان آگیا۔ دل آرام کی

بارہ دری میں گھنٹوں قبل جمع ہو گیا۔ بعد انتظار انیس تشریف لائے۔ رونق افروز
ممبر ہوئے زیر ممبر نفیس دوست کے ہمراہ مسند پر ہی بیٹھے تھے۔ انیس نے وہ
رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا "پیارے ہماری غزل سنو" اور یہ کہہ کے سلام شروع
کیا۔ جس کا یہ ایک شعر ہے۔

کہتے تھے سرور علی اکبر کا مزا ہائے ہائے کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائے گی

یہ پورا سلام اس قدر رُلیکی تھا کہ چاروں طرف سے گریہ کی صدائیں بلند ہو گئیں۔
معلوم ہوا کہ انیس کا لکھنؤ اور مرثیہ گوئی میں کسی صنف سخن کا محتاج نہ تھا۔
مرثیہ اُن کے لیے بنا تھا اور وہ مرثیہ کے لیے۔

غزل کا عیب | حقیقت یہ ہے کہ غزل کے دو مصرعے ایک ذہین شاعر کی بنا کے لیے وہ
سنگین ستونوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر ان کو پہلی پہل مضبوط پکڑ کے شاعری کے دوسرے
دشوار گذار راستوں میں قدم بڑھایا جائے۔ تو منزل مقصود تک پہنچنا سہل ہے۔ وجہ یہ ہے
کہ غزل جس کا نام ہے۔ اُس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ساتھ ہی ساتھ مشکل بھی اس لیے
ہر شعر خیال کی ایک اور ایک سی تصویر پیش کرنے کی قابلیت رکھتا ہے جس کی تکمیل ایک سنجیدہ
قلمکار ہی خوب جان سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کی نگاہوں کے سامنے مناسبت و نیکی کا فراق
کا نقشہ ہر وقت موجود ہو۔

جب ایک شعر اس طرح مکمل ہو جاتا ہے تو اس شاعر کا خیال دوسرے مضمون کو
اٹھاتا ہے۔ اور اسمیں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ اس بحر میں کسی دوسرے
مضمون کو دماغ میں چھیڑ دینا پہلے خیال کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن کے لیے کم و بیش تسلسل کی سخت ضرورت ہے مثلاً قصیدہ۔ مثنوی مرثیہ وغیرہا میں۔ رہا غزل کا مذاق سلیم کی حدوں میں رہا ہے کسی مہمل بلکہ وہی ہے۔ بہرحال ایک شعر جس کو شعر کہہ سکتے ہیں اپنی خاص طرز میں پختہ اور بے تل ہو سکتا ہے فکر نقاد دونوں کا فرق خوب سمجھ سکتی ہے۔ لہذا مثال دینا یا موازنہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔

رشید کا سلسلہ ملا

رشید اول تو ایسے طبقہ میں پیدا ہوئے تھے کہ شاعری حسن کی میراث تھی لطف یہ کہ ننھیال کے افراد مرثیہ گوئی میں طاق۔ ددھیال کے غزل گوئی میں شہرۂ آفاق۔ ان کا وجود ایک ایسا نونہال تھا جس کو گلستان سخن کی دو ہواؤں نے پرورش کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ انھوں نے سخن کی دونوں صنفوں سے بہرۂ کامل حاصل کیا۔ اور دونوں خاندانوں کے کمال کو زندہ رکھا۔

رشید اپنے نانا کی حیات میں سن تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ اور ان کے کمال کے مظاہروں سے سبق حاصل کرتے رہتے تھے۔ اکثر غزلیں میر انیس کو دکھائیں۔ مگر زیادہ عشق مرحوم کو۔ چنانچہ اس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے۔

میں ہوں سلطان سخن مجھ سے بڑھی شان سخن،

علاوہ دوسرے تعلقات کے شاگردی عشق کی طرف بھی اشارہ ہے۔

میں بھی ہوں وارث طرز سخن میر انیس	ہوں تعشق کے سبب لکھنؤ میں رئیس
مونس خلق ہوں میں میری زباں ہے جو سلیس	ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں ہم اور انیس

خوب تحقیق ہیں تخمین سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو

رشید کی غزل پر زیادہ تر سید صاحب تعشق مغفور کے طرز خیال کا

پورا پورا پرتو نظر آتا ہے۔ حالانکہ ابتدا اُن سے رشید کو شرف تلمذ حاصل نہ تھا
ہاں جناب سید باقر صاحب حسینی مرحوم اُن کے ساختہ پرداختہ تھے۔ معلوم ہوا کہ
رشید کی طبیعت میں فطرت نے مذاق سلیم کا دسر پہلے ہی سے ودیعت کر دیا
تھا۔ جس پر صرف معمولی صیقل درکار تھی۔ جو تعشق مرحوم کی صحبت سے حاصل ہوئی۔ مگر
عشق مرحوم کے بعد رشید تعشق ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

رشید کا عمر | رشید کے تمام کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت نظم اُن کی
پہلی کوشش صفائے بندش۔ روانی۔ اور لطافت محاورہ میں صرف ہوتی تھی۔
اُس کے بعد درستی خیال چستی مضامین کی طرف توجہ مبذول کرتے تھے۔ چنانچہ
اُن کے کلام میں بعض اوقات ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جس پر ہم نے زبان کی جد
جد و جہد نے مضامین کو بالکل سادہ کر دیا ہے۔ نظم میں کبھی زبان۔ یا نرم زبان ہونے
کے یہ معنی کبھی نہیں۔ کہ خوبی مضامین ہاتھ سے جاتی رہی۔ بلکہ ایک زبان کہنے والے
شاعر کو دونوں پہلوؤں پر برابر کی نظر ڈالنی چاہیے۔ جس کی کوئی دوسری مثال
سوائے انیس کے نہیں ملتی۔ نرم گرم پہلو سب کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ میں
یہ نہیں کہتا۔ کہ رشید اس کلیہ سے مبرا ہیں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگرچہ
بعض مقامات پر اُن کے ہاں شعر بالکل سادہ نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ خوبی ضرور
پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں زبان و مضامین دونوں کو کامیابی ہو جاتی ہے۔ اُس کا
کیا کہنا۔ چنانچہ ایک مطلع فرماتے ہیں۔

خاک حسرت لے گئے دل لٹے ویراں کر گئے | آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

دوسرے مصرعہ میں جس حسن سے محاورہ صرف ہوا ہے۔ اُس کا جواب نہیں۔

رنگ تغزل

رشید غزل اپنی زبان میں کہتے تھے۔ جس میں معاملہ بندی کا عنصر قوی۔ عاشقانہ مضامین بشیر غزل میں شوخی اسی قدر ہوتی ہے۔ جہاں تک وہ مذاق سلیم کی حدود میں رہے۔ اور مبتذل نہ ہو جائے۔ اور یہی مشکل ہے۔ مرحوم نے سلاست و اثر کو اپنے کلام میں اس قدر جگہ دی ہے کہ ایک معاملہ گو شاعر سے اتنی امید نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ رشید کچھ کہا چاہتے ہیں۔ صفائے بندش۔ سلاست بیان اس پر کچھ اور اضافہ کرتے پیش کرتے ہیں۔ کوئی مضمون غیر مانوس ترکیبوں [illegible] نہیں پاتا۔ اور حقیقت میں تمہاری اسی کا نام ہے۔ مضامین عالیہ کو الفاظ کے قالب میں بند کرنا ہر شاعر کا کام نہیں۔ بہت بھڑک کے اور بھٹکیں گے۔ خیر جو رنگ جس کو پسند ہو وہی بہتر۔ جس زمانہ میں ہندوستان جدید تمدن کی ایک منزل اور طے کر چکے اور فن تنقید کو رواج ہوگا۔ اس وقت عوام اس کا تصفیہ کر سکیں گے۔

رشید کے مذاق کے متعلق رائے

میں رشید کے مذاق شعر کا ذکر کر رہا ہوں اور اسی سلسلہ میں ایک فصل پیش کرتا ہوں جناب محشر لکھنوی

نظم

ایک دن زیارت کو [illegible] حاضر ہوا۔ باتیں کرتے کرتے مجھ سے فرمایا "کیوں محشر! شاعر کو کیا کرنا چاہیے؟" میں نے عرض کی "تا امکان جذبات اصلی نظم کرنے کی قوت ہونی چاہیے" فرمایا "اس کے ساتھ اتنا اور بڑھا دو۔ کہ سیدھی زبان میں"

نوٹ

واقعی عربی اور فارسی کی سنگین ترکیبوں اور لفظوں کا بوجھ غزل نہیں اٹھا سکتی۔

رشید اپنے شاگردوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ تکمیل کا مزا اُسی وقت ہے جب مناسب الفاظ میں نظم بھی ہو جائے۔ اگر کسی شاگرد کی غزل میں کسی جگہ کوئی ثقیل لفظ ہوتی تھی، تو اُس کو ایسے عمدہ لفظ بدل دیتے تھے کہ مطلب ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا۔ بلکہ اور شعر میں ترقی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک روز ایک شاگرد نے غزل پیش کی جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

دلِ مجروح پہ احسان تمہارا ہوتا　　اور اک تیر اگر زخم پہ مارا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں بجائے "زخم پہ" کے "پاس سے" بنا دیا۔ اب شعر کو پڑھیے تو سلاست و ترقی لفظ کا اندازہ ہو۔ حاصل کلام۔ کہ وہ خود بھی دارادۂ زبان تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی اُمید رکھتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے قول کی تائید میں جناب عزیز لکھنوی کا ایک خط درج کرتا ہوں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۱

"زمانہ کا رنگ ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اور اس سے زبان کی نشو و نما میں رشید کے عہد میں زبان اردو میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ کچھ تو بضرورت اور کچھ اخبارات و رسائل اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی دریا دلی اور فیاضی سے خصوصاً پنجاب سے یہ گھٹائیں اُٹھیں۔ اور ناواقفانِ زبان پر چھا گئیں مگر رشید اپنے اصلی مرکز پر قائم رہے اور اُردو کی اصلی عظمت کو کھونا انداز نہیں کیا۔

رشید کی نظم میں عمق نہیں ہوتا تھا۔ صاف صاف شعر کہتے تھے۔ مگر رنگ و اثر کا ملمع تقریباً ہر شعر پر ہوتا تھا۔ تخیل میں ندرت کم ہوتی تھی مگر سلاست و تاثر کے دریا بہتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُن کا کلام

زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ تو ان اضافات و ترکیب فارسی سے اُن کو اُنس نہ تھا۔ میں نے غلبہ کی صحبت میں ان کو ایک غزل اپنی سنائی۔

شرح جنون سلسلۂ جنباں کیے ہوئے

بیٹھا ہوں چاک چاک گریباں کیے ہوئے

مطلع سُن کر کہنے لگے "بھائی میلا مصرعہ بالکل فارسی ہو گیا" اور اشعار کی داد دی جس کا ذکر میرے لیے مناسب نہیں۔ ماداراں میں میر نواب علی صاحب کے مکان پر ایک قصیدہ خوانی کی صحبت تھی اُس میں حضرت رشید و حمید بھی تھے۔ میں نے قصیدہ پڑھا

شب ہوئی انجمِ تابندہ کا لشکر نکلا

بزمِ فتح لیے ماہِ منور نکلا

اس قصیدہ میں جو استعارہ زبان کا سلسلہ لیے ہوئے تھے اُس کی داد حضرتِ رشید نے خاص طور پر دی۔

اس سے مقصود اپنی تعریف نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ نظم میں ان کا تمام تر خیال صرف زبان پر رہتا ہے اُسکا التزام وہ خود بھی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے تھے۔

حاشر جب ذہلی رقمطراز ہیں۔

ایک روز جناب رشید کی خدمت میں سہ پہر کو حاضر ہوا گرمیوں کا زمانہ تھا مسجد کے حوض میں نہا رہے تھے مجھے دیکھکر بے اختیار فرمایا بھئی محشر ابھی ابھی یہ شعر کہا ہے سبحان اللہ۔ یہ مطلع پڑھا۔

طاقت آئی مگر اعضا میں نہ یکبار آئی	آئی ہم جسم پہ آئی تو پریشان آئی

میں نے تعریف کر کے عرض کی کچھ اور ہنس کر بولے ٹھیرو ہم کہہ لیں عرض کی دوست کے بعد یہ شعر پڑھا۔ ؎

کبھی بجلی بھی گرے یا تو عجب کیا پوچھیے	آج کیا تھا جو سوئے گور غریباں آئی

مکرمی جناب مرزا امداد علی بیگ صاحب برادر جناب نواب نصیر الممالک میرزا شجاعت علی خاں بہادر۔ یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ ماہ ربیع الاول میں جب رشید مجالس پڑھنے کلکتہ تشریف لائے۔ نواب نصیر الممالک کے یہاں مجالس شروع ہوئیں۔ ایک مجلس کسی ایرانی ذاکر نے پڑھی چونکہ زبان فارسی تھی اس وجہ سے پورا مضمون مجلس عوام نہ سمجھے۔ صرف خواص اہل علم حظ آیا۔ وہ سب لیکن بعد ختم مجالس لوگوں نے جناب رشید سے خواہش کی۔ کہ اس روایت اور مضمون کو جو اس مجلس میں ذکر ہوئے تھے۔ مرثیہ کی صورت میں نظم کر کے سنا دیں جناب رشید خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز جو منبر پر تشریف لے گئے۔ تو یہ مرثیہ کا وہی مضمون تھا جو مجلس گذشتہ میں لوگوں نے فارسی میں سنا تھا سامعین کو حیرت ہوئی کہ رشید نے اس قدر بلند اور اس خوبی سے کیونکر وہ مضمون نظم کر لیا تھا کہ آج تک حضرات کلکتہ رشید کو جب یاد کرتے ہیں تو اس مرثیہ کو اُن کے کمال کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ بقول میر نواب صاحب موصوف "ایک وقت میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لیا مشاقوں کے سر دیکھ کوئی بڑی بات نہیں۔

ذیل کا واقعہ مرحوم کے انتظام شاعری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے۔

نقل ایک روز جناب رشید مرحوم بیٹھے ہوئے کچھ تصنیف کر رہے تھے۔

میں پہونچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر بادامی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھپا۔ نے شروع کیے
میں نے جسارت کر کے کہا "کہ آپ کیا خراب کاغذ پر تصنیف فرماتے ہیں"۔ جواب ملا۔
"بھائی یہ معشوقوں کے خط و خال۔ ناز و ادا۔ غمزہ و عشوہ کا ذکر نہیں۔ جس کے لیے عمدہ
اور نفیس کاغذ کی ضرورت ہو۔ بلکہ مصیبت زدوں کا مرثیہ ہے۔ اُس کے لیے مصیبت زدہ
لباس۔ یعنی خستہ کاغذ ہونا چاہیے +

لطیفہ

جناب حکیم سید فضل علی صاحب عرف میرن صاحب جو رشید کے کمال
احباب میں ہیں۔ اُن کے بڑے صاحبزادہ صاحب عالم کی شادی حکیم صاحب موصوف
کے بھائی کی دختر سے ہوئی۔ جلسۂ نکاح میں رشید بھی مدعو تھے جب عقد ہو چکا
تو جناب رشید نے حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا ؎

یہ آپس کی شادی بہت مجھ کو بھائی ۔۔۔ کہ سمدھی کے سمدھی ہیں بھائی کے بھائی

اہل محفل اس برجستہ مزاج شاعرانہ سے بہت خوش ہوئے +

لکھنؤ کے مشاعرے اور رشید | آخر تک اب تک رشید مشاعروں میں بیشتر شریک ہوتے تھے مگر اب
مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ مشاعروں کی شرکت کم کر دی تھی

قریب قریب تمام مرثیہ گویوں کا یہی اصول ہے۔ کہ جب مرثیہ کی طرف زیادہ
توجہ ہو جاتی ہے تو غزل گوئی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

رشید نے گویا غزل گوئی ترک نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ فکر غزل کو مرثیہ میں
اس خوبی سے صرف کرتے تھے کہ غزل کا لطف بھی آتا تھا۔

جس مشاعرہ میں کامل۔ ماہر مشتاق۔ جاوید۔ عارف۔ اوج ایسے کامل فن

موجود ہوتے تھے وہاں رشید بھی ضرور ہوتے تھے۔ یہ حضرات اپنی بہترین فکروں کے نمونے پیش کرتے تھے۔ اور خاطر خواہ داد سخن لیتے تھے۔ مگر زمانہ شاہد ہے کہ جب رشید مغفور کے سامنے کنول آتا تھا۔ تو بزم مشاعرہ میں ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ اور ان کی شاعری کا چراغ جلنے لگتا تھا۔ اور جب غزل پڑھتے تھے۔ اُس وقت کا سماں قابل دید ہوتا تھا۔ اُن کے بعد اول تو کوئی پڑھتا نہ تھا۔ اور اگر پڑھا بھی تو گویا رسم مشاعرہ کا ادا کرنا سمجھیے + اس مرجعیت کا سبب وہی اُن کی سادگی کلام اور جذبات نگاری تھی +

فاخر مرحوم نے لکھنؤ میں ایسے ایسے مشاعرے کیے کہ زبان زد عوام ہیں جناب عشق مغفور اور جناب غضنفر علی خاں عرف بڑے بھیا صاحب حکیم کے مشاعروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ آخری وقت میں خدنگ نظر کے مشاعرے بھی عظیم ہوئے ان مشاعروں کے بعد رشید نے گویا شرکت صحبت سخن بالکل ترک کر دی تھی نستی نوبت رائے صاحب نظر نے ادبا اردو کی بیش قدر خدمت کی ہے۔

ایک مرتبہ ۱۹۰۸ء میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے مشاعرہ کیا طرح تھی

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

یہ مہتم بالشان مشاعرہ میر تقی میر علیہ الرحمہ کی "صد سالہ یادگار" میں قائم ہوا تھا پروفیسر مرزا رسوا نے اس بزم میں ادبا اردو کے متعلق ایک نہایت پُر زور تقریر کی تھی۔ لکھنؤ کے تمام سخن سنج۔ اور خوش گو حضرات جمع تھے۔ جناب رشید سے بھی وعدہ لیا گیا۔ اور مرحوم نے بپاس خاطر عزیز منظور کیا۔ لیکن مشاعرہ میں تشریف نہیں لائے۔ بلکہ دوسرے روز جناب عزیز سے خود ملنے آئے۔ اور عذر عدم شرکت یہ کیا۔ کہ اگر میں یہاں شریک ہوتا۔ تو دوسروں کو شکایت کا موقعہ مل جاتا۔ یہ کہہ کے چند اشعار

طرح میں سُنائے۔ اور واپس تشریف لے گئے ؛

انجمن دائرہ | اراکین معیار کی طرف سے ایک انجمن موسوم بہ "انجمن دائرہ" قائم ہوئی تھی جناب رشید اُس کے پہلے جلسہ میں تشریف لے گئے تھے مگر اُس کے بعد پھر کبھی شریک نہ ہوئے رسالہ معیار کے ابتدائی دَور میں رشید کی متعدد غزلیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

جناب عزیز تحریر فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں معیار کے مشاعروں کی لکھنؤ میں دھوم تھی۔ اکثر تلامذہ طرح میں اُن سے غزلیں بنوالے جایا کرتے تھے۔ خود مشاعروں میں شرکت ترک کر دی تھی مگر کبھی کبھی طرح میں غزل یا سلام کہہ لیا کرتے تھے اور ہم لوگوں میں سے جب کوئی ملتا تھا تو کہتے تھے "بھائی تمہارے یہاں کی طرح میں۔ میں نے بھی کچھ کہا ہے" سلام ہوا تو ممبر پر سُنایا۔ غزل ہوئی تو آنے والے نے مکان پر سُنی +

مسئلہ حفظ زبان | جہاں جہاں علوم کے مرکز ہیں وہاں کے حضرات علم ادب کی ترقی کے متعلق گاہے گاہے اپنی سرگرمیاں مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں جن سے جلسوں میں وقتی چہل پہل ہو جاتی ہے اس سے بحث نہیں کہ وہ نتیجہ خیز ثابت ہوں یا نہیں۔ زمانہ جس رو میں بہا چاہتا ہے بہا جاتا ہے کسی کی تدبیر اُس کے خلاف کارگر نہیں ہوتی اسی طرح لکھنؤ میں بھی ایک مرتبہ "حفظ زبان" کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اُس وقت کے نامور ادیب اور شاعر غیر معمولی جوش کا اظہار کرنے لگے۔ ہر شخص بجائے خود اپنے کو تحفظ زبان کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ جناب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر مرحوم کی تحریک سے نواب باقر علی خاں صاحب رئیس لکھنؤ (خلف نواب مہدی علی خاں صاحب مرحوم) نے اپنے وسیع مکان میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا تاکہ مسئلہ مذکور کے متعلق عملی تدابیر پر

غور کیا جائے۔

یہ جلسہ بالکل مغربی تہذیب کے موافق تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں حضرات جاوید حمید حامد۔ عزیز۔ آبر۔ وغیرہم شریک تھے +

رشید صدر مقرر ہوئے

جلسہ شروع ہوا۔ اور چند موقر حضرات کی تحریک و تائید سے حضرت رشید رئیسِ مجلس منتخب ہوئے۔ رشید کرسی صدارت پر بیٹھے غالباً اُن گوشہ گیر دعافیت پسند مرحوم کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ جنابِ حامد مغفور اور دیگر حضرات نے تحفظِ زبان، کے متعلق تقریریں کیں۔ اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ ایک "لغت خاص" لکھنؤ کے اربابِ فن اور اہلِ زبان مرتب کریں بانیِ جلسہ نے اپنی عالی ہمتی سے اس کام کے لیے ایک رقم کثیر دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مگر انجام کیا ہوا، یہ نہ پوچھیے۔

حضرتِ رشید نے اُس جلسہ میں کچھ باتیں درمیان میں اور کچھ ختم صحبت پر فرمائی تھیں۔ جو نہایت دلچسپ اور کارآمد تھیں۔ ایک محل پر اصناف سخن کے متعلق فرمایا تھا "غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ان سب کی زبانیں الگ الگ ہیں"۔ جس کی شرح اہلِ زبان اور ماہرینِ فن بہت کچھ کر سکتے ہیں +

انتخاب

خاندانِ انیس کے مشہور مرثیہ گو جناب میر علی محمد صاحب عارف مرحوم کی مجلس سوم میں جنابِ رشید تشریف لائے چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے پس ماندگانِ عارف سرشک آلود آنکھوں سے اس بزرگ خاندان کے اظہارِ تعزیت کو قبول کر رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔

"افسوس خاندانِ انیس کا شیر اُٹھ گیا۔ یاد رکھو عارف کا مثل نہ تھا۔ اب لکھنؤ کو قدر ہوگی کہ مرثیہ گوئی کیا چیز ہے۔ اور فن کس کا نام ہے"۔

مجھے اس وقت جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم کا شعر یاد آگیا جو انھوں نے گویا ایسے ہی مواقع کے لیے تصنیف کیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

یہ منزلت بھی غنیمت ہی اہلِ دُنیا کی ملا کے خاک میں ذکر کمال ہوتا ہی

ایک دوسرے موقعہ پر فقیر مؤلف اور چند دوسرے حضرات خدمتِ رشید میں حاضر تھے کہ ایک شاگرد نے ایک نظم اصلاح کے لیے پیش کی جو کسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے کہی تھی۔ رشید نے اول سے آخر تک نظم کو دیکھا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کے فرمایا "اشہر قومی نظم کا کہنے والا اس وقت صفی سے بہتر لکھنؤ میں نہیں"۔

تفاخرِ شاعرانہ دوسری چیز ہی۔ رشید میں خود نمائی اور خودستائی بالکل نہ تھی اُن کی نظروں میں ہر صاحبِ کمال کے کمال کا صحیح اندازہ تھا اور اُسی کی مناسبت سے عظمت بھی اہلِ فہم کے نزدیک انصاف پسندی بجائے خود ایک کمال ہی۔

بہر مثال عدائے سخن میر تقی کا انصاف

میر تقی میر نے اپنے معاصرین کا ایک مختصر تذکرہ فارسی میں لکھا ہی جو ابھی انجمن ترقی حیدرآباد کی طرف سے چھپا ہی۔ اُس میں قابلِ لحاظ یہ امر ہی کہ میر صاحب نے ہر شاعر کے کلام پر انصافانہ نظر ڈالی ہی۔ اور میرے خیال میں داد تذکرہ نویسی دی ہی۔ لیکن قابلِ صد تعریف یہ امر ہی کہ وہی سودا جو اُن کا مردِ میدان اور فنِ شاعری کا حریف تھا۔ اُس کی نسبت میر کے قلم نے ذرا لغزش نہیں کی۔ اور جس انصاف کا وہ مستحق تھا۔ اُس سے کچھ زیادہ اُس کی مدح سرائی کی ہی۔ ذیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مرزا رفیع المتخلص بہ سودا کہ جوانے خوش خلق و خوش خوئے۔ گرم جوش یار باش۔ شگفتہ روئے۔ مولدِ او شاہ جہان آباد است۔ نوکری پیشہ۔ غزل و قصیدہ

وثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی۔ ہمہ را خوب مے گوید۔ سرآمد شعرائے اودھ است
بسیار خوش گو است ہر شعرش طرفے لطف رستہ رستہ در بین بندی
الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ
پیش فکر عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ
او را شاید۔ قصیدہ در ہجو ہست گفتہ بہ تصحیک روزگار۔ و در ارحد مقدور در او
صفتہا بہ کار بردہ از الصاق طرح غزل باہم می افتد۔ از معتمدات روزگار است
حق تعالے سلامتش دارد۔" (از مذکرہ ص ۳۲۰)

رشید و شعرائے لکھنؤ | تمام شعرائے لکھنؤ رشید کو سند مانتے تھے۔ اور اُن کے تصنیف کو نظر قبول سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی رسالہ شعر و سخن کا جاری ہوتا تھا تو رشید کے کلام کو باعث وقعت سمجھ کر ایک ممتاز جگہ چھاپتے تھے۔

لفظ "آبدست" مونث ہے | چنانچہ جب لفظ "آبدست" کے متعلق تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہوا تو حکیم جلال مرحوم۔ اور دیگر نامی شعرا نے لکھا کہ آبدست مذکر ہے۔ اس وجہ سے کہ "آب" اور "دست" دونو مذکر ہیں لہذا دونوں کی ترکیبی صورت بھی مذکر ہونی چاہیے۔

جس وقت جناب رشید سے اس لفظ کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "میں۔ اور میرا خاندان اس لفظ کو مؤنث بولتا ہے" اور مزید شہادت یہ دی کہ انیس مغفور بھی اس لفظ کو مؤنث بولتے تھے۔ رشید اس دور آخر میں ایسے خوش نصیب شاعر تھے جن کو اُن کے معاصرین نے بھی مانا۔ یہ بات اس عہد حریت میں اہمیت ہے

رسالہ معیار کی ابتدا | نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مغفور نے جو ادب اُردو کی خدمت کی ہے اُس کی داد کون دے سکتا ہے ع وخدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم نے "معیار" ایک ادبی رسالہ کی بنا ڈالی۔ جس کی عجب انوکھی طرز تھی حصۂ نثر کے معاونین جو قابل ذکر ہیں یہ تھے۔ مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی۔ مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی۔ مولوی سید احمد صاحب ناطق لکھنوی منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔

معاونین حصۂ نظم کے لکھنؤ کے خوش گو شعرا

مثلاً۔ جناب صفی۔ جناب ثاقب۔ جناب عزیز۔ جناب محشر۔ جناب احسن۔ جناب آرزو جناب بلیغ۔ جناب ثروت۔ جناب بہار۔ جناب متذکر۔ جناب فاضل وصف شفیق وغیرہم اس کے خاص ممبر تھے ہر ممبر کے مکان پر باری باری ماہوار مشاعرہ ہوتا تھا۔ پہلے منتخب قوافی طبع آزمائی کے لئے دیدیے جاتے تھے۔ اور پھر ہر قافیہ کے تحت میں ہر ایک کا شعر لفافہ بند صورت میں معمار میں چھاپا جاتا تھا۔ چند شعر بہار نمونۃً تحریر ہیں

مشاعرہ جناب محشر ۔ قافیہ ۲۷ ۔ نومبر ۱۹۱۱ء

احسن ۔ دل میں اس بت کے بعد دل ہوتا ۔ ہر صورت دور رہ زندگی یوں گذرجانا

آرزو ۔ اُدھر سے گر اُدھر جاتا اِدھر سے گر اِدھر جانا ۔ یونہی اکثر ترے کوچہ میں ہم کو دن گذر جانا

بلیغ ۔ دل جناب میں اک ہوک سی اٹھتی ہے رہ رہ کر ۔ تعجب ہے نہ ہو اپنا زمانہ سے گذر جانا

ثروت ۔ نہیں ممکن ترے ہاں کو بھی دل چھوڑ کر جانا ۔ کہ ہے دشوار صحرائے محبت سے گذر جانا

بہار ۔ یہی میرے لیے گویا کہ جینے ہی ہے مرجانا ۔ تمہارا دیر کرنا وقت وعدہ کا گذر جانا

وانشش ۔ ہزاروں کو یونہی دیکھا ادھر آنا اُدھر جانا ۔ مگر پھر بھی نہ اس دنیا کو ہم نے رہ گذر جانا

فضلی ۔ جب ایسی زندگانی ہو تو پھر بہتر ہے مرجانا ۔ کسی تکلیف کا حد تحمل سے گذر جانا

عزیز ۔ یہاں تک متصل رونا کہ آخر کار مرجانا ۔ قیامت ہی قیامت سر سے پانی کا گذر جانا

محشر - دیارِ عشق تک لازم ہے مجھ کو یہ خطر جانا ۔ کہ مندا آنکھیں کیے اکسا یک منزل سے گذر جانا

اس صورت میں پڑھنے والا اچھی طرح تصفیہ کر سکتا تھا۔ کہ کس شاعر نے کونسا قافیہ اچھا کہا ہے؛ اوّل اوّل یہ رسالہ ہندوستان بھر میں شعرا کا منظورِ نظر رہا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ حتی الیس کی شکر رنجاں بڑھتی گئیں۔ اُسی قدر اُس کی مقبولیت میں کمی آتی گئی۔

علی محسن خاں صاحب آبر مرحوم مدیر معیار گو شعر و سخن کے سچے دادادہ تھے۔ اور اُس کی خدمت کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے۔ لیکن معیار اپنے درجہ کا وقار قائم رکھنا اُن کی استعداد سے باہر تھا۔ جب تک مالی امداد فراہم کرتے رہے۔ اُس وقت تک اُس کی مقبولیت میں ضعف پیدا نہ ہوا۔ مگر جب معاونین کا قلم رکا۔ اُس وقت سے معیار میں ایسا ضعف پیدا ہوا کہ بیمار سا ہو کر رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حامد مغفور کی زندگی ہی میں بند ہو گیا۔ اور پھر متعدد کوششیں اُس کے جاری کرنے میں ناکامیاب رہیں۔

معارکوں سے ہوا

میری رائے میں معیار کے بند ہونے کی زبردست وجہ یہ تھی کہ آبر مرحوم نے ایک مضمون کے لکھنے میں خود رائی سے کام لیا جس کا ناگوار نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بہت سے وہ وقیع ممبر جو معیار کے سچے معین تھے کنارہ کش ہو گئے۔ اور پھر شریک نہ ہوئے۔ اگرچہ اُن لوگوں نے جناب حامد مغفور کے اخلاق حسنہ اور وجاہت ذاتی کے اثر سے کھلم کھلا مخالفت نہ کی۔ مگر دلوں میں غبار باقی رہا۔

اُس مضمون کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اساتذۂ وقت یعنی رشید۔ عارف۔ اوج

جاوید فصاحت۔ الجم وغیرہم۔ ہر شاعر سند طلب کو بغیر اُس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کیے ہوئے ایسی سند نہ دے دیا کریں جس کا وہ مستحق نہو۔ کیونکہ ایسے اسناد سے عوام میں زبان کے متعلق غلط فہمی کا اندیشہ ہے مبادا ایسے سند یافتہ شعرا کی خود ساز بندشیں یا محاورات جو ادب اُردو کی حدود میں نہوں۔ دوسرے غیر مطلع اصحاب میں رواج پا جائیں اور عام ادب پر غیر صحیح اثر پڑے۔"

گو آپ مرحوم کا یہ خیال درست تھا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ مرحوم سے تھوڑی سی غلطی ہوئی اگر اُس مضمون کا مسخ فقرہ آفرد اساتذہ لکھنؤ کی طرف ہوتا بلکہ عام ہوتا۔ تو غالباً کسی کو شکایت نہوتی اور معیار بھی اپنی پوری رفتار سے جاری رہتا۔

اب میں اس بحث کو ترک کر کے مطلب پر آتا ہوں۔ یعنی ماہانہ مشاعروں کے علاوہ معیار کا ایک سالانہ بہاریہ مشاعرہ ایک وسیع پیمانہ پر ہوا کرتا تھا اور مصرعہ طرح کی ردیف لفظ بہار ہوتی تھی۔ موسم بہار ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء میں بہاریہ مشاعرہ جناب شہنشاہ حسین صاحب وکیل کے باغ میں ہوا جو گومتی پار واقع ہے۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

لوح معیار نظر آتی ہے تصویر بہار

اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا مشاعرہ کے قبل ہی تمام شہر میں اس مصرعہ کے چرچے تھے۔ اور واقعی طرح بھی نئی تھی۔ قریب قریب لکھنؤ کے سب شعرا نے اس طرح پر طبع آزمائی کی عام اس سے کہ شریک مشاعرہ ہوئے ہوں یا نہیں رشید مغفور سے لوگوں نے غزل بھیجنے کی درخواست کی مگر اُنھوں نے غزل نہیں کہی۔ مشاعرہ کے بعد کئی مہینے گذر گئے۔ یکایک رجب کا چاند نکلا۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہو گئی۔ سامعین میں آخری تاریخوں کا شدید انتظار

معیار کا بہاریہ مشاعرہ اور رشید

شروع ہوگیا۔ حتےٰ کہ متعدد نئے مرثیے ختم ہو چکے۔ اور ہر مرثیہ کے متعلق رائے عامہ قائم ہو چکی۔ اب جو بیس رجب کی صبح نمودار ہوئی عاشقِ آلِ اطہار رکن العزا میر نواب علی صاحب (جن کا مشہور تعزیہ ۹ ربیع الاول کو اٹھتا ہے) کی مجلس کے سامان حسینہ اکرام اللہ خاں میں نظر آنے لگے۔ جوق جوق لوگ آکر جمع ہونے لگے۔ اور ذاکرِ خاندانِ رسالت جناب رشید کا انتظار ہونے لگا اتنے میں پالکی نمودار ہوئی رشید آئے اور تھوڑا سا آرام لینے کے بعد زیب ممبر ہوئے۔ مرثیہ شروع ہوا ساقی نامہ ختم ہوا۔ سامعین نشۂ مضامین میں سرشار۔ ساقی کوثر کو یاد کرکے ذاکر کو مست آوازوں میں داد دے رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے مرثیہ کا ورق الٹا۔ بہار آگئی گل و بلبل کے نازک تعلقات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ گئی۔ مضامین تازہ کا رنگ مجلس پر چھا گیا۔ کہ ایک مرتبہ رشید نے بلند مگر نرم آواز میں جناب عزیز۔ جناب محشر کو یوں مخاطب کیا۔ بھئی عزیز سنو! بھئی محشر سنو! لوگ سمجھے کہ کوئی خاص مضمون ہے جس پر ان حضرات کی توجہ چاہتے ہیں مگر رشید نے جو بند شروع کیا تو معیار کے گذشتہ ہار یہ مشاعرہ کی طرح میں۔ پھر کیا تھا۔ یہ دونوں نے رشید کی قوت غزل گوئی کا ثبوت دینے لگے۔ فرماتے ہیں۔

فصل بدلی کہ نہ تیر ہوا تیر ہوا	ہیں دلِ اہلِ حسد زخمی شمشیر ہوا
اب تو ہر شے میں نظر آتی ہے تصویر ہوا	گل رگوں سے ہوا ہے لشکر زنجیر ہوا

کبھی آہستہ کبھی تیز ہوا چلتی ہے
اسی موسم میں جنوں خیز ہوا چلتی ہے

خود بہار آئی ہے کیا چیز ہے تصویر ہوا	قطرے شبنم کے بنے بہرِ فراں تیر ہوا

ہوئی ہر شئے میں شریک ایسی ہے تاثیر بہار
در کی زنجیر کا اب نام ہے زنجیر بہار

حسن پورا ہے جواں صورت جاناں ہے بہار
انتہا ہو گئی خود اپنے پہ نازاں ہے بہار

بہار یہ مشاعرہ کے قبل لوگوں کا خیال تھا اور اُس کے بعد بھی قائم رہا۔ کہ ردیف اور قافیہ کی اضافت کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ لیکن رشید کی مشاقی اور خداداد طبیعت نے قافیہ و ردیف میں ایسا ربط پیدا کر دکھایا۔ کہ سبحان اللہ یہی وجہ تھی کہ تمام لکھنؤ کے شعرا ہم آواز ہو کے کہتے تھے "ہم کو سوائے رشید کے مرثیہ کے دوسرے میں مزا نہیں آتا" ذیل میں انتخاب غزلیات پیش کش ناظرین ہے۔ رشید کے پورے مجموعہ غزلیات کا طبع ہونا غیر ممکن ہے۔ ہاں اگر کسی وقت ادب اُردو کی قسمت نے یاوری کی تو اُس کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

انتخاب غزلیات

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی
موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

بعد مردن کھینچ لایا جذب دل سینہ پہ ہاتھ
ایک انگوٹھی میں جو پہنے تھا نشانی آپ کی

رنگ عالم کا بدلنا آپ کے صدقہ میں ہے
جمع کر رکھی ہیں پوشاکیں پرانی آپ کی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے
کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا تن کی

شروع اہل محبت کے امتحان ہوئے
یہ اُن کو ناز ہوا ہے کہ ہم جوان ہوئے

سرخ آنکھیں ہیں ابھی اُٹھے ہیں خواب ناز سے
ہاتھ ماتھے پہ ہے لیٹے ہیں عجب انداز سے

لاکھوں مستانوں کی مٹی میں ملی ہیں آنکھیں
تیرے کوچہ میں تہ دیتے ہیں ذرات مجھے

طالب دید سے یوں بے خبری کرتے ہیں
آپ سو یا کیے آنکھوں میں کٹی رات مجھے

ہجر میں ابر سیہ آئے گا دکھ دینے کو
اب کے رونے ہی میں کٹ جائے گی برسات مجھے

لے نہ جاؤں کہیں حاجت یہ دعا مانگ رشید
اتنی توفیق دے اے قاضی حاجات مجھے

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو

اُن کی آرائش بھی ہوتی ہے موافق وقت کے
دن کو منہ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو

ٹوٹے تارے سیکڑوں بولی قدسیوں کے دل ہلے
درد سے جس وقت ہم تم کو پکارے رات کو

چونک اٹھتے سب مری آواز جاتی دور تک
خوف تھا دل میں چھپک اٹھی نہ پارے رات کو

ہجر کی مدت نہ ہوگی ختم ثابت ہو گیا
دن کو ذرے گن چکا میں اور تارے رات کو

آگئی صبح قیامت اور میں سویا نہیں
پھر نہ آئی نیند جب سے تم سدھارے رات کو

دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے ہر سو رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

گرم رفتار ہے تیری یہ بتا دیتے ہیں
دم بدم لو مرے نقش کف پا دیتے ہیں

دل کی تم بات سمجھتے ہو زباں گو نہ ملے
خوب سنتے ہو جو چپکے سے صدا دیتے ہیں

صاف کرتے ہیں ابھی تیر یہ وہ تیغ ادا
دوست آ کر مجھے پیغام فنا دیتے ہیں

جاگو اے مملکت عشق کے ہونے والو
شہ کے دربان در بار صدا دیتے ہیں

نظر میں خانۂ صیاد بھی ہے گلشن بھی
کہ ہم کو یاد قفس بھی ہے اور نشیمن بھی

چمن میں تھیں مجھے ساری اذیتیں راحت
بہت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

بنا تھا کیا مرا سیلاب اشک یک رواں
کہ جس سے تر نہوا ایک تار دامن بھی

لگا کے کان سُنے کون التجا میری
در قبول کے قابل نہیں دعا میری

صدا یہ آتی ہے جنبش سے تیرے دامن کی
نسیم میری ہے گلزار میں صبا میری

یہ خوف ہے کہ میں کچھ عرض کر نہیں سکتا
مرے لبوں سے لپٹ جاتی ہے صدا میری

جفائیں سہہ کے جو رہتے نہیں ہیں ہٹتا
گلے سے مجھ کو لگا لیتی ہے وفا میری

وہی حیات کا باعث ہے جس پہ مرتا ہوں
وہی مرض ہے مرا اور وہی دوا میری

کون کہتا ہے کہ اور ایسا ہمیں دل چاہیے
گر عنایت ہو تو غم سہنے کے قابل چاہیے

حسرت و درد و الم اندوہ و غم پیدا کیے
دیکھ لے اصاف سے مجھ کو بڑا دل چاہیے

وہ تو ہیں معشوق پر جینے کو اتنا فرق ہے
آپ کو دل چاہیے مجھ کو گل چاہیے

ہاتھ پہلو پر دھرا ہی کرتے ہیں دلبر کی فکر
پوچھتے پھرتے ہیں کیوں ہیں دل چاہیے

ہر نفس جس کو زیادہ ہو تمنا قتل کی
اے مری جاں اُس کو ہر دم ایک قاتل چاہیے

طعن ساقی کی یہ ہے ہاتھ میں گو ساغر ہے
استخارہ کوئی کر لے تو بہت بہتر ہے

شوق مضمون مرادوں کے بڑھا دیتا ہے
ایک کلمہ کو اگر دیکھیے اک دفتر ہے

گو خزاں آگئی باقی ہے ابھی شان بہار
گل کی ہنسی ہے کہ بلبل کا شکستہ پر ہے

ہوئے جب گور غریباں میں تکلف نہ رہا
دیکھیے پاؤں کسی کا ہے کسی کا سر ہے

نہ رہا اب تو کوئی وقت خزاں سے خالی
جو ہوا ہے چمنِ دہر میں وہ صرصر ہے

دل ہی ڈوبے بھی ڈبوئے بھی بچائے بھی رشید
یہی کشتی - یہی دریا ہے - یہی لنگر ہے

ہر اک تربت کے گل چومیں نشانِ پائے جاناں کو
چلے دو گام جنبت کر دیا گو رِ غریباں کو

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ایماں کو
کہ بسم اللہ کر کے چاک کرتا ہوں گریباں کو

تمہارے دم سے ہے اے جانِ ہا شہر میں آنا
نہیں منظور گر تم کو نہ چھوڑیں گے بیاباں کو

مجھے جوشِ جنوں ہے لیکن اتنی ہوشیاری ہے
لپیٹے ہاتھ دامن میں بچاتا ہوں گریباں کو

گھرا ہے میکدہ پر ابرِ شرما کر نہ برسے گا
ذرا دم بھر نہ روئے منع کر دو اپنے گریاں کو

جو ممکن ہو تو کچھ سامان راحت جمع ہو جائے
پریشانی ستایا کرتی ہے تیرے پریشاں کو

نظر بازی کی کیفیت ترے قیدی کو حاصل تھی
اب آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں روزنِ دیوارِ زنداں کو

رشید اُن کو پکارا قبر سے اغیار کہتے ہیں
بتائیں کس نے بتائیں ساکنِ شہرِ خموشاں کو

سیئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے
تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

دل ہوئے ہیں ہوسِ بوسہ میں زلفوں کے اسیر
اب تو آ پہنچے ہیں نزدیک تمہارے شانوں کے

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ پایا ہے
استخواں ملتے ہیں گوشوں میں بیابانوں کے

کیا ترے نام میں تاثیر ہے سبحان اللہ
ایک دل ہو گئے تسبیح کے سو دانوں کے

شاعروں کے لیے تو ہیں یہ باعث ہو رشید
تم نہ جایا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

نہیں ہے وہ میاں تم کو جان جاں ہم لوگ مرتے ہیں
ہمیں خود آتی ہے ہچکی جو تم کو یاد کرتے ہیں

عجب بے رحم ہیں طفل حسین گلزار ہستی ہیں
گلوں کو توڑتے ہیں بلبلوں کے پر کترتے ہیں

خبر کب شانۂ و آئینہ کی تھی عہد طفلی میں
جوانی آگئی ہے جب سے وہ پھر دن سنورتے ہیں

ذرا ہٹ جائیں سب منظور ہے اس وقت تنہائی
مری تربت میں وہ شانہ ہلانے کو اترتے ہیں

عام چلنے کو ہے سب اہل نظر بیٹھے ہیں
آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

تیرے بے تاب کبھی آہ جو کر بیٹھے ہیں
زلزلہ آگیا ہے سیکڑوں گھر بیٹھے ہیں

ظلم صیاد نے پر وار سے مایوس کیا
فکر میں سامنے رکھے ہوئے پر بیٹھے ہیں

صاف باطن ہوں نظر آرہے ہیں مجھ کو صاف
گو میں بیٹھے ہوں ادھر ہوں وہ ادھر بیٹھے ہیں

دل جلے قبروں سے نکلے بھی تو کیا حاصل ہوا
بس یہی نہ گرمی روز قیامت بڑھ گئی

ایک مدت کا ہے قصہ کسی جانب دل تھا
اب نہیں یاد یہ پہلو ہے کہ وہ پہلو ہے

سلسلہ جنبان وحشت ہیں نئی تدبیر سے
طوق منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے

دل کے ٹکڑے جوڑیے یا ساتھ لیتے جائیے
میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

فتح میں بھی کی گئیں ہم پر ہزاروں سختیاں
سیکڑوں طوفاں اٹھے آب دم شمشیر سے

اے نظر انصاف سے دیکھو ذرا سوئے شہید
حاشقا اب غزل کیا ہو سکے مجھ پیر سے

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور تھا
ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیے

جو نہ صبر اور دم بھر ترے بیقرار کرتے
ابھی برق کا طریقہ فلک اختیار کرتے

غم و درد و رنج سہہ کر تجھے دیتے ہم دل اپنا
انھیں بے وفائیوں پر ترا اعتبار کرتے

وہ نہ آئے مر گئے ہم اگر آتے بھی تو کیا تھا
یہی جان صدقہ کرتے یہی دل نثار کرتے

جو خلاف امید کے ہو تو شکستہ خاطری ہے
کئی ٹکڑے دل کے ہوتے جو تم ایک دو کرتے

خبر اس کی پہلے ہوتی کہ نہ آئے گا یہ ہم کو
تو نہ شیدہ شعر کا فن نہ ہم اختیار کرتے

تفرقہ ڈال دیا آ کے ترے تیروں نے
ٹکڑے بھی اس دل صد چاک کے باہم نہ ہے

شمع گل ہو گئی کیوں پاس رہیں پروانے
عشق بے کار ہے جب حسن کا عالم نہ ہے

خلق میں سیکڑوں طوفان اٹھا کرتے ہیں
ہے جو منظور نظر چشم مری تر نہ ہے

لطف نظارہ پہ موقوف ہے اپنی ہستی
منہ ادھر آپ نے پھیرا کہ ادھر ہم نے ہے

گر بھلا چاہے تو خط یا ریر مائل نہ ہو
وہ پھلے پھولے جو اس سبزہ سے بیگانہ ہے

ہم کو بعد دفن بھی ایسا تصور چاہیے
رات بھر بالیں پہ شمع روئے جانانہ ہے

کوہ غم ہیں سر کے ٹکرانے سے صحرا تنگ ہے
کیا قیامت ہو اگر بستی میں دیوانہ ہے

ہلتے ہیں بازو جوش اڑنے کی ان کے دل میں ہے
حسرت پرواز پوشیدہ پر بسمل میں ہے

ذرہ ذرہ میں نہیں کے ہیں ہمارے لخت دل
حلقہ حلقہ آہ۔ زنجیر در قاتل میں ہے

لختِ دل کا تذکرہ کرتے بھرے آتے ہیں اشک
ساتھ یادِ کارواں سالارِ رہ منزل میں ہے

کچھ ایسے کام تھے باقی کہ ساتھ جا نہ سکے
معاف کیجیو اہلِ عدم ہم آ نہ سکے
بس ایسے حال میں عاشق کو آپ مت دیں
حواس جا نہ سکیں اور ہوش آ نہ سکے

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا
نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھے ہے گریباں پر
زلیخا حال کی ایسے جو دیتی تھی یوسف کو
کہ جس کی آہ گھر میں برق لپکی آ کے زنداں پر

گو آپ کو خدا نے جانِ جہاں بنایا
لیکن عفت تو یہ ہے نامہربان بنایا
کہتا ہے ہاتھ اٹھا کر سوئے شجر یہ گلچیں
کیوں بلبلوں نے تو نے پھر آشیاں بنایا

جلوہ گر بام پہ جب مہرِ رخِ یار نہ تھا
کوئی کوچہ میں بجز سایۂ دیوار نہ تھا
تیری ٹھٹکی میں دہانے کی ادا آفت تھی
کس کا دل تھا کہ قریب لبِ سوفار نہ تھا

سامنے لاؤں جگر دل کو نشانہ کے لیے
میں اشارہ تو ادا سے نارکِ مژگاں سمجھا

تیز کرتا ہے چھری قصد اور ہے صیاد کا
اے اسیرانِ قفس وقت آگیا فریاد کا

ہمصفیروں کی طرح سے چھوٹ کر کیا خاک ہو
میں ہوں پروانہ چراغِ خانۂ صیاد کا

مری آنکھوں کو ہی خوں بار رہنا
ذرا اے ابرِ تر ہشیار رہنا

پسِ مردن نہ رکھے گی صبا خاک
ترے کوچہ میں ہی بے کار رہنا

محفل میں جو روز آتے ہیں اُن لوگوں سے پوچھو
کب متصل در مرا بستر نہیں ملتا

زبانِ تیغ سے کب گفتگو میں رہ پاتا
میں کوئی خون کا قطرہ نہ تھا کہ بہ جاتا

زاہد سا شخص بن گیا ہی میکدہ میں دُزد
چپکے سے ہاتھ جانبِ پیمانہ لے گیا

غش میں بھی تھا یار ہی کا انتظار
چونک اُٹھا میں جب ذرا کھٹکا ہوا

اے رشید اشکوں کا پھولِ عمل
دامنِ محشر بھی ہی بھیگا ہوا

بعد مرنے کے نہ اُتریں پاؤں سے گر بیڑیاں
غیر ہم سے اور جنوں سے سلسلہ رہ جائے گا

بے ترے حکم نہیں یاں سے میں جانے والا
غیر ہی کون مجھے یاں سے اُٹھانے والا

سینہ پہ جب کبھی کوئی آنسو ٹپک گیا
اس درجہ ناتواں ہوں کلیجہ دھڑک گیا

جنوں ہی وجہ بقا ہم شکستہ حالوں کا
کہ آب خضر ہی پانی ہمارے چھالوں کا

ہیں پریشاں جمع کر کے آپ کے ارمان ہم
اپنے دل کو جانتے ہیں حشرۂ مسدان ہم

ٹکڑے شکستہ حال دل ناتواں کے ہیں
اتنا نہ پوچھیے یہ مسافر کہاں کے ہیں
کیا جوڑتے ہیں آپ دل پارہ پارہ کو
معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں
دندانے جا بجا تری شمشیر میں نہیں
شکوے زبان تیغ پہ محو ناتواں کے ہیں

اے شب غم صبح ہو جائے گی یا آئے گی موت
فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو نہیں یا ہم نہیں

غم دیدۂ حسن کا یہ تفرقہ ہے
چمن میں گل ہے بلبل آشیاں میں

مجھ کو منظور ہے مرنے پہ شبِ تاری ہو
اور احباب کو ہے فکر کفن بھاری ہو
آتشِ حسن جوانانِ چمن بھڑکا دیں
جو گل سرخ کی پتی ہو وہ چنگاری ہو

کیا سبب ہے کیوں تڑپتی ہیں قفس میں بلبلیں
دیکھ اے صیاد گلشن کی ہوا آئی نہ ہو
میری چشم شوق کو کیا ہو گیا ہے اے رشید
اس سے لڑنا کیا کبھی جو آنکھ شرمائی نہ ہو

جی بھر کے دیکھ سکتے نہیں گل کو عندلیب
کھٹکا لگا ہوا ہے کہیں باغباں نہ ہو

آج یوں خاک نشینِ درِ قاتل اٹھے
سب کڑوں لاشیں انھیں سب کڑوں ہوا اٹھے
ساقیا شیشۂ مے توڑ اجب درد سے
مست محفل سے تری خدا ہے اٹھے

کیسا کوچہ ترا دنیا سے اٹھا جاتا ہوں
آج کچھ ایسی طبیعت مری گھبرائی ہے

میرے درد عشق سے ایذا ہے ساری خلق کو
موت بہتر ہے جو اتنا طول بیماری کرے

عشق گلیوں میں پھرے لیکن نہ پردہ ہو
حسن پردہ میں رہے اور گرم بازاری کرے

مجنوں نے راہ عشق میں کیے مرے قدم
الفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

جو ہوا ہے صورت باد مخالف تیز ہے
دل کا بیداں ہے کہ اک صحرائے آفت خیز ہے

دل کے ٹکڑے کر دیے باتیغ کر بزہ ہیں
کس قدر تیغ زبان یار مجھ پر تیز ہے

ہے جنون شیدا بہ تک گیا لکھنؤ مردم گیا
کیا زمیں ہے جو اجڑ جانے پہ مردم خیز ہے

پھر چکے پامال گو غربیاں کر چکے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے آپ احساں کر چکے

خاک حسرت سے گئے دل ہائے دیوار گئے
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

قفس میں نام میرا بے وفا کہنے کا یہ باعث تھا
ہوا بے دار کرنے کی ہر اک یہ منہ کل خاک

جوش وحشت میرے تو دل کو بنا بھی سہی
میں جہاں ہوں وہیں دل ہو صحرا بھی سہی

دل میں وقت ذبح حسرت ہے کہ دیکھیں آپ کو
مرنے مرنے غیر جیتے کی تمنا بھی سہی

تیرہ بختی سے ہی شکوہ مفلسی سے ہی گلہ
روشنی ممکن نہیں شام غریباں کیا کیے

اپنی وحشت سے ہی شکوہ دوسرے سے کیا گلہ
ہم سے جب بیٹھا نہ کوئے عاشقاں کیا کیے

تیری یہ اپنی تیغ کی تیزی کیجیے گا ناز
پہلے چلے تو کاٹ کے دو چار دیکھیے

اڑ کر پڑی ہی خاک شہیدان ناز کی
دامن کی سمت بھی دم رفتار دیکھیے

یاس و حسرت سے چھپل کے کر الا ہی گئی
ہمکو سن کا ہی فقط اک شوق پہ کے بوجھ

نہ زخم زن کھلا کوئی نہ ٹپکے خون کے قطرے
کوئی ہنسنے والا ہی نہ کوئی رونے والا ہی

رشید احباب نہ کیا ہے کہ رخت سفر باندھ
ٹھہرا نہ تو کرنے حافظ اک جانے والا ہی

کب تو سے دامن محبت سے رہا ہوتا ہی
کوئی سو مرتبہ مر جائے تو کیا ہوتا ہی

داغ دل غیرت بیٹھے تو دکھاؤں تم کو
[illegible] لالہ ہوں [illegible] کی

آرزو مند شہادت کی وصیت سب سے ہی
[illegible]

تھا شام سے کچھ حال کا اپنے عم ابسا
[illegible]
لے جوش جنوں کیوں یہ ہنسی جلد ہم
[illegible]

نظریں اُن کی میری سمت کو پھر پھر کے آتی ہیں
کہ جیسے ہر طرف گرتا ہوا سر شار جاتا ہے

آج پھر کل کی طرح ہجر کی رات آتی ہے
دیکھیے کیا ہو وہی دل ہے وہی پہلو ہے

اس بے خودیِ عشق کا عالم ہی جدا ہے
جب غور سے دیکھو نہ فلک ہے نہ زمیں ہے
احباب کو ہے فکرِ سحر ہو نہ وہ آئیں
یاں صبح کے ہونے ہی کی اُمید نہیں ہے

دامِ گیسو سے جو چھوڑا تو گذر جائیں گے
عاشقِ زُلف اسی رات کو مر جائیں گے
وہ نہلاتے ہیں تو کہتے ہیں بگڑ کر گیسو
چھوڑیے چھوڑیے ہم آپ سنور جائیں گے

ہم گئے دُنیا سے لاکھوں دل کے ارماں رہ گئے
تھے جو تم کو یاد وہ بھی عہد و پیماں رہ گئے
کون اپنے خون کا قاتل سے دعویٰ کر سکا
ہاتھ اُٹھ کر سیکڑوں سوئے گریباں رہ گئے
ناتوانی یہ بتا دے کس سے چاہوں گا مدد
گر اُلجھ کر ہاتھ میں تارِ گریباں رہ گئے
قتل گہ میں پاؤں سے تا دیر ٹھکرایا کیا
ایک سر پر سیکڑوں قاتل کے احساں رہ گئے

کاش اُٹھتا ہوں جو محفل میں چھلکتا ہے جام
میں تو واقف ہوں کہ بیتابی کی لذت دل میں ہے

رسید اور رشید | رشید نے میدانِ مرثیہ گوئی میں جلد سے جلد اس وجہ سے قدم رکھا۔ کہ اول تو یہ ناسہال کی میراث تھی ثانیاً یہ کہ کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہ تھا۔ جو آئندہ اُن کی اور اُن کے متعلقین کی معاش کا سبب ہوتا۔ سو یہ کہ عشق و تعشق کے دورانِ حیات میں حصول کمال کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ چنانچہ مختصر مختصر متعدد مرثیے تصنیف کیے۔ اور عشق مغفور کو دکھائے جو موضوعاتِ شاعری کے اُس وقت بہتر سے بہتر جاننے والے تھے۔ دوسرے تعشق مرحوم کے خداداد رنگِ کلام نے رشید پر کچھ ایسا اثر کیا کہ بغیر اصلاح لیے اُن کے کلام میں تعشق کی نازک خیالیوں کی بُو آنے لگی۔ ماسوا اس کے خود بھی طبّاع تھے۔ اس وجہ سے جدّت طبع کے میدان میں دن دُونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ مگر یہ زمانہ گویا صرف مشق ہی مشق کا تھا گو کبھی کبھی عشق یا تعشق کی پیش خوانی بھی کر دیتے تھے۔ اور لکھنؤ والوں کے سامنے اپنی آئندہ بہار کے نمونے پیش کر دیتے تھے۔

انیس | اب وہ وقت آیا کہ عشق کا انتقال ہوا۔ تعشق نے وفات پائی۔ جدھر دیکھتے ہیں کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ چار و ناچار طبیعت پر زور ڈالا۔ اور چُست مرثیے کہہ کے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اُدھر تیرِ انیس اپنی پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ یعنی انیس کے کلام کا سکّہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ عوام میدانِ سخن میں جب قدر کی نظر سے انیس کو دیکھ رہے تھے اُس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے کا حصہ ہو سکتا ساتھ ساتھ مشکل یہ تھی کہ جو راہیں میدانِ مرثیہ گوئی میں انیس کا قلم پیدا کر گیا تھا۔ اُس کی پابندی بھی ناگزیر تھی۔ کیونکہ انیس کی آواز کا اثر ابھی محو نہ ہوا تھا۔ اس لیے کوئی دوسرا رنگ مطبوع عوام نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی متنفس انیس کے رنگ سے علاوہ کسی دوسرے رنگ کو

اختیار کرنا بھی تو بے سود۔ وہی مرثیہ وہی چہرہ۔ وہی سحر وہی خاندانِ رسالت۔ وہی واقعات کربلا۔ وہی لڑائی وہی نتیجہ اور ان سب کا ایک بہتر کہنے والا نفیس موجود پھر رشید کو دفعتاً اتنی قبولیت کہاں سے ہو جاتی؟

لیکن رشید بھی سمجھتے تھے کہ اگر نیا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا جائے تو ایسا تو ہو جس کو لوگ اچھا نہ کہیں تو برا بھی نہ کہیں۔ لہذا جو مرثیہ کہا اُس میں اپنی انتہائی قوت صرف کی۔ اور ایسے موزوں نکالے کہ زبان زد عوام ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جہاں مرثیہ گوئی کا ذکر ہوتا تو نفیس کے ساتھ ساتھ رشید کا نام بھی ضرور لیا جاتا۔

(رشید کی شہرت کا پہلا سبب)

اس قدر جلد رشید کی مرثیہ گوئی میں شہرت کا باعث مؤلف کی رائے میں دوسرے اسباب کے ساتھ اُن کا ایک مشہور غزل گو ہونا اور جب تک نفیس زندہ رہے رشید بھی مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ اگر نفیس کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں اوّل تھا تو رشید کا نام بھی غزل گوئی میں فرد لیکن چونکہ رشید نے اپنی قوت غزل گوئی سے مضامین مرثیہ گوئی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لہذا اُن کی برق مثال طبیعت نے بھی اپنا کام کیا اور حدت خیال اور چستی زبان کے ایسے ایسے انمول موتی پیش کیے جنہوں نے رشید کو رشید بنا دیا اور سامعین کے دلوں میں جگہ کرا دی۔

اب رشید میدانِ مرثیہ گوئی کی پہلی منزل طے کر کے شہرت کے اُس نمایاں مقام پر پہنچے جہاں سے یہ صدائیں آنے لگیں۔ رشید نے کیا [illegible] عوام کی اس قدر افزائی نے رشید کا دل ہاتھوں بڑھا دیا اور مضامین سخن نے اُن کو زمانہ آئندہ کا سخن وارث منوا دیا۔ چنانچہ اس رباعی میں [illegible]

رباعی

ہو عشق کا رنگ ہر سخن میں میرے
لاکھوں گلِ مضموں ہیں چمن میں میرے
مشتاق کلامِ انیس کا مجھ سے سنیں
گویا ہے زبان اُن کی دہن میں میرے

عروج | ہم نے ذکر کیا ہے کہ جب تک اہلِ کمال کی ترقی کے اسباب فراہم نہیں ہوتے اُس وقت تک اُس کا جوہر نہیں کھلتا۔ مگر جس وقت ایک حد تک اُس کا نمونہ شناس ہو جاتا ہے تو پھر اُس کو مزید مدد کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ دوسرے اُس سے مستفیض ہونے لگتے ہیں اور حالوں کی طرح یہ کہ ہر شے کو ابتدا میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ پھر احتیاج ہی نہیں رہتی مثلاً ایک پودے کی کونپل پھوٹتے ہی اُس کو باغباں کی وہ سب تربیت کا محتاج ہوتا ہے کہ جب اُس کو پوری نشوونما ہو جاتی ہے تو وہی غنچہ ثمر بنتا ہے اور پھولوں کی ہریالی کھلتا ہے۔ یہی حال عوام کا ہے کہ ایک زمانہ تک درختِ کمال کو پرورش کرتے ہیں۔ اُس کے سایہ میں بیٹھ کر فرحتِ روحانی حاصل کرتے ہیں یہی یہاں وہ گمنامی کے تاریک پردے سے نکلا۔ اُس کے فیوضات عوام میں پھیلنے لگے۔ اور اُس کا نشو و نما عوام دنیا کی لوحِ دل پر محفوظ ہونے لگا +

موصاکل | آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا سے نظم و نثر میں جو اہلِ کمال کو مسند الملکی بجا چکے ہیں۔ اُن کے بعد کی آنے والی نسلوں نے اُن کے کمال سے کیسے کیسے دامن بھرے ہیں میدانِ سخن میں دیکھیے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص میر کا رنگ کہتا ہے فلاں غالب کی ترکیبوں کا دلدادہ ہے فلاں داغ کا اتباع کرتا ہے فلاں طرزِ مرثیہ میں انیس کا پیرو ہے فلاں دبیر کا +

یہ کیسے نوکتے ہیں۔ فلاں شخص آزاد کی سی عبارت لکھتا ہے فلاں شبلی کا

چہرہ اُتارتا ہے۔ فلاں کی عبارت میں رنگینیِ شرر ہے +

اگر ان لوگوں کو زمانہ نے اظہارِ کمالات کا موقعہ نہ دیا ہوتا۔ تو آج کتابِ ادب میں سادے ورق نظر آتے اور وہ بھی بے رونق +

لکھنؤ میں جہاں انیسؔ اور دبیرؔ تھے وہاں ایک تیسرا اگرچہ مختصر گروہ عشقؔ کے ماننے والوں کا بھی ضرور تھا۔ اور یہ حضرات بھی دوسروں کی طرح اپنے پسندِ خاطر ذاکر کے خاندان سے محبت رکھتے تھے +

چنانچہ ایک شخص مرزا عبد العلی نامی اشرف آباد میں رہتے تھے۔ اور عشقؔ مغفور کے فدائیوں میں تھے۔ اُن کی مجالس میں سوائے خاندانِ عشقؔ کے دوسرا ذاکر زیبِ ممبر نہ ہوتا تھا۔ عشقؔ مرحوم سے بڑے بڑے معرکہ آرا مرثیے اُن کی مجالس میں پڑھے۔ اُن کے بعد تعشقؔ مرحوم کے لیے وہی ممبر زینۂ شہرت بنا۔ اور اب آخر میں رشیدؔ کی باری آئی۔ اور اُن کا فرض ہوا۔ کہ اُس آبائی ممبر کے وقار کو اپنے بزرگوں کی طرح برقرار رکھیں۔ چنانچہ بعد وفات تعشقؔ مرحوم رشیدؔ نے ابتدائی نہیں بلکہ آزمائشی مجلسیں اشرف آباد میں پڑھیں +

ان مجالس کے مجمعوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ عشقؔ، تعشقؔ، وحیدؔ۔ دُنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ یہ عیش کا آخری زمانہ تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے کہ کوئی سی آواز ممبر سے بلند ہو۔ اور گذشتہ اہلِ کمال کے انتقال کے بعد اُن کے اشتیاقِ سماعت کو مطمئن کرے۔ کہ یکایک رشیدؔ کی اُبھرتی ہوئی طبیعت نے اُن کی شاعرانہ دلچسپیوں کے برقرار رکھنے کا وعدہ کیا اور آخر عمر تک اُس کی پابندی کی +

بہار و ساقی نامہ

رشید کی زبان تو جیسی تھی ویسی تھی۔ انھوں نے طرزِ مرثیہ میں طباعی سے کام لیا۔ اور واقعی اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ جدت یہ تھی کہ انھوں نے مرثیہ کے مقررہ مضامین میں سے ایک گوشہ نکالا اور وہاں غزل کے چلبلے مضامین اس خوبصورتی سے صرف کیے کہ مرثیہ کا ایک نیا جزو ہو گئے۔ وہ کیا وہ ساقی نامہ اور بہار۔ رشید کے ہر مرثیہ میں ساغرِ گل کے اذکار وہ بہار دکھانے لگے۔ کہ شیدائے مضامینِ غزل مست ہو ہو کر داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اس کیا تھا اب رشید کو بہار کلام کا رستہ مل گیا۔ سامعین کو مست حال کر دینے کی راہیں معلوم ہو گئیں۔ بہار کہی اور یوں کہی۔

بہار

گل و بلبل میں جو باتیں ہیں ذرا گرما گرم
آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اللہ ری شرم
اس قدر وصلِ بہاری سے کیا ہے آزرم
آب مخمل کی طرح ہو گئے ہیں کانٹے نرم

کھیل ما ملسلِ مالاں کو مسکیبائی کا
اک قدم دل سرم
پھول ہے داغ جگر لالۂ صحرائی کا

جھنجھنی پائے سیہ دوری کی آہٹ
اُٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ ہے بالی کروٹ
ہر طرف پھیلنے لگی ماہ بیخ بیخ ہٹ
اُٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگٹ

دل کھلے فصلِ گلستاں کا ماسعا رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلف نہ رہا

ساقی نامے کہے اور یوں کہے۔

ساقی نامہ

ہم ازل سے مئے الفت کا پیا کرتے ہیں جام
مہد طفلی میں بھی رہتا تھا اسی کا ہم کو کام
اُسی صورت سے ہوئی ختم جوانی کی شام
صبح پیری ہے صبوحی کا ہے ساقی ہنگام

نشہ میں میری محبت کا بھر دے جام ساقی
نیند کچھ کھلنے کے مرے جی کے ہے آرام ساقی

مئے الفت تری دل میں ہے کہ سینہ میں پڑی
اس کی مدحت سے تو اسلام کی کھیتی ہے ہری
دھتی ہے جس کی شان مدحت کو تری
کبھی ہوتی نہیں مستوں کو تری بے خبری

ایسے ہی خمار میں دن رات پیا کرتے ہیں
ہم تو سوتے میں ترا نام لیا کرتے ہیں

دھو دیا ہے تو نے رحمت کے مرا دامن تر
نہاں زیری مئے الفت سے کوئی شے بہتر
میں تو ہو گئے ہوں گر کہ لیے ہو ساغر
سر سے نزدیک تو ہے تیغ شراب کوثر

نہر فردوس ہے کیا ہے کا خریدنا ساقی
تیرے ہاتھ کی شکن میں ہے پیمانہ ساقی

سافیا کا گنہگار رہا چھ صد و بیل
سچ کہوں خلد میں جانے کی نہ تھی کوئی بیل
مئے الفت تری پائی گی بخشش کی دلیل
آنے تھے غصہ میں بالیں پہ مرے عزرائیل

پینے والا ہے مرے ساتھ کا یہ جان گئے
منہ مرا دیکھتے ہی ہنس دیئے پہچان گئے

اگرچہ رشید کے قبل کے مرثیہ گویوں نے اس شعبہ کو بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا

تو زیادہ اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ انیس و نفیس کے یہاں بہار اور ساقی نامے پائے جاتے ہیں۔ مگر مختصر اور شاذ زمانہ کی رفتار کے ساتھ رشید کی پختہ کاری بھی ترقی کرتی گئی۔ کم از کم ہندوستان کے تمام شیعی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ اور جا بجا سے طلب ہوتے رہے +

سچ تو یوں ہے کہ رشید مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کے موجد تھے اور ان مضامین کو مرثیہ کے ہر حصہ میں کھپا دینے کی اس قدر حیرت انگیز قوت پائی تھی کہ جہاں چاہتے تھے بے تکلف ساقی کو پکار لیتے تھے جس موقع پر چاہتے تھے حسین آرائی کرنے لگتے تھے۔ اور کچھ ایسے اسلوب سے کہ سننے والے یکایک تحیر ہو کے بلند آواز میں داد دینے لگتے تھے +

قابل غور یہ امر ہے کہ ذیل کے بندوں کے پہلے جناب عباس کے نہر پر تشریف لانے کا ذکر کرتے چلے آتے ہیں اور سامع کو یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ عنقریب ساقی نامہ شروع ہونے والا ہے۔ کہ یکایک رشید یہ مصرعہ پڑھتے ہیں ع نہر پر جائیں گے ہم تھوڑا سا پانی لینگے + اور ساقی نامہ کی یوں ابتدا ہو جاتی ہے کہ

ساقیا نہر پہ سقائے حرم جاتا ہے	کچھ برا رنگ زمانہ کا نظر آتا ہے
ہو کئی فکر سوا نشہ جو کم پاتا ہے	جلد دے جام پہ پیکش ترا اجلاتا ہے

نشہ ہو صاف تو امداد کی دعائی لکھوں
خوب اڑ جائے طبیعت تو لڑائی لکھوں

ناتواں پیر ہوں تن گل گیا غم سے کل کے	سادیا چول ہوئی جام ہوا ہلکے ہلکے
پینا منظور ہے شہ نیر سے تا دم نکلے	ہو یہ ساماں تو مری عمر کا ساغر چھلکے

ہر ست ضعف اسی نشہ کے سہارے پہنچوں
آنکھ ہو بند تو کوثر کے کنارے پہنچوں

یا (مدح عباس کے لشکر کا علم دار ہوں میں) اس مرثیہ میں اوبر کے مندوں میں سفر شہید کربلا سے تمام عالم کے متاثر ہونے کا ذکر کرتے کرتے (گر گل و بلبل اس مصرع سے چھیڑ دیتے ہیں (کچھ تو ہو روح کو فرحت کہ عجب عالم ہے) اور مضامین بہار سے سامعین کے دلوں میں اک تازہ لہر پیدا ہو جاتی ہے۔

اور ہی رنگ ہوا آ گئی گلشن میں بہار
زلف سنبل کی ہوئی مشک فشاں عنبر بار
یوں ہوا دوڑی کہ تھرائے چمن کے اشجار
کر دیا سبزۂ خوابیدہ کو جلدی بیدار

دل پہ قابو نہیں بیتاب نظر آتی ہیں
بلبلیں شاخوں پہ جا جا کے اتر آتی ہیں

جس طرف دیکھو زمانہ کی بہار آئے نظر
یاسمن وہاں ہے تو عالم ہے یہاں سوسن پر
درمیاں میں ہے جو سورج تو کہیں اس کی خبر
دوپہر بیچ میں ہے صبح ادھر شام اُدھر

صنعت صانع قدرت کو کوئی کیا بدلے
یہ نہ بدلیں گے اگر لاکھ زمانہ بدلے

رشید کو رشید کی حیثیت سے دیکھئے۔ اور داد دیجئے کہ وہ ساقی نامہ اور بہار کے موجد تھے، اور کسی شئے کا موجد اس کو اپنی زندگی میں اتنا درجۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔ کہ اس کی تکمیل آئندہ کامل کن دماغوں کے احسان سے بے بیار رہے یعنی آنے والے اہل نظر اس کے کمزور پہلوؤں کو درست نہ کریں +

تاریخ ادب میں ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کا اثر اول

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انیس و نفیس کا کمال اُن سے زیادہ ہے۔ رشید اُن کو نفیس سے اتنا تعلق
ضرور تھا کہ ماموں تھے۔ اور جس نے اُن کے کمال سے ان کے خاندان کو وجہ تفاخر
ہو سکتا تھا۔ نہ اُن کے کمال سے اُن کے خاندان کو اُن کا رنگ و غرض الگ ان کا
جدا۔ مگر زبان انیس ضرور مشترک تھی۔ نتیجہ بارہا رشید مرحوم نے نفیس مغفور سے
کہا "ماموں جان اُردو میری مادری زبان ہے" اور اُن مغفور نے جواب دیا "ہاں بیٹا
سچ کہتے ہو"

رشید عارف | نفیس کے بعد عارف مغفور نے زمانہ کو اپنا معرفت بنایا۔ اور خوب خوب فرمایا
اس مقام پر اتنا لکھ دینا ضروری ہے کہ جہاں تک لفظ مرثیہ گوئی۔ اپنے اصلی معنوں میں
مستعمل ہو سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عارف مغفور کی جدت کا میاب رہے۔ عارف مغفور
مرثیہ رونے رُلانے کے لیے کہتے تھے۔ اس سے کسی کی تفریح خاطر مقصود نہ تھی۔
شان مرثیہ قائم رکھنے میں وہ اپنے پرنانا انیس کے پورے پورے پیرو تھے۔ میں یہ
نہیں کہتا کہ رشید نے مرثیہ گوئی کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ عارف
مغفور نے زبان انیس کو مدنظر رکھتے ہوئے مصائب پر زیادہ نظر ڈالی میں ایک
حد تک ماننے کو تیار ہوں کہ رشید کے مرثیے سلاست۔ محاورہ۔ نزاکت خیال
جدت تخیل کے بہترین نمونے ہیں اور خوبیاں عارف کے یہاں کم سہی۔ مگر مرثیہ
جس کا نام ہے وہ عارف کے کلام میں بہت پایا جاتا ہے۔ رشید نے بھی اکثر مرثیوں
میں ایسی شان مرثیہ قائم رکھی ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ چنانچہ منجملہ اور مرثیوں کے
اُن کا یہ مرثیہ جس کا مطلع ہے

"شاہ یہ ماریہ میں ابر الم چھائے تھے"

اُن کی بہترین تصانیف ہے اور جس کا حصہ مصائب ایسا ہے کہ اُن کے دوسرے مرثیوں میں اُس کی نظیر کم ملے گی بہرحال اُن شہید نے بھی مصائب پر خوب خوب نظم ڈالی۔ مگر چونکہ جنہیں شوخ طبیعت پائی تھی اور سادگی پسند نہ آتی تھی۔ جو بات کہتے تھے اُس میں ایک بات پیدا کر دیتے تھے۔ برخلاف اس کے مصائب کے لیے سچے واقعات اور پُر اثر الفاظ سے سوا جدت تخیل یا رنگ خیالی کی چنداں ضرورت نہیں ہے

حاصل کلام یہ کہ شہید و عارف اور دبیر آخر میں انیس کا نام روشن کر گئے اور اپنے اپنے انگنا میں بادشاہی کی۔ بلکہ خدا نے انیس ہی کو عنایت فرمایا تھا کہ اُن کے یہاں شوخی اور شان مرثیہ دونوں چیزیں برابر کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی اُس شاعر وہی کے خصوصیات میں سے ہے۔

انیس نفیس | انیس کے بعد انیس مرحوم کے خاندان کا نام ایسا ہی روشن کیا جیسا ایک صاحب کمال کا قابل فرزند کر سکتا ہے لیکن چونکہ نفیس مغفور کی استعداد علمی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ فلسفہ منطق ادب عربی و فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچ چکی تھی۔ منشی بیر عباس صاحب شوستری کے چشمہ علوم سے کافی سیراب ہو چکے تھے اس وجہ سے کلام نہایت چست اور مضبوط صنائع و بدائع سے مملو۔ لطائف شعری ہر پہلو سے مکمل اُس پر طرہ یہ کہ باوجود اس قدر استعداد کے کلام میں ثقالت کا بالکل پتہ نہیں خلاصہ یہ کہ ایک باخبر شاعر تھے۔ اُن کی زبان بھی انیس کی زبان سے جدا نہ تھی۔ فرق اتنا تھا کہ نفیس انیس کی اردوائی زبان سے ادا کرتے تھے۔

اس تمام تمہید سے میری غرض یہ تھی کہ انیس کے بعد اُن کے نام کو برقرار رکھنے والے نفیس و شہید عارف تھے۔ جب تک اردو کا آخری لفظ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

طریقہ | ظاہر ہے کہ [illegible] ہونا چاہئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرغوب عوام بھی جاہل ہے۔ اس کی طرز مرثیہ خوانی سب سے جدا ہے اور خوب ہے۔

رشید کا مرثیہ پڑھنے کے لیے وجاہت خاص اور آواز مناسب زیادہ درکار ہیں رشید تو ایسے قوی الجثہ تھے۔ اور بفطرت سے آواز بلند عطا ہوئی تھی۔ پھر مرثیہ خاطر خواہ کیوں کر پڑھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ وہ پرانے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر جسم کو ذرا معمولی حرکت دینا ہی قبیح سمجھتے تھے اکثر فرماتے تھے کہ انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا وہ صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے تھے۔ آج کل کے پڑھنے والے تو جسم کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رشید بہت نرم لہجہ میں سیدھا سادا پڑھتے تھے۔ اور خود بھی کہتے تھے "میں اس سے بہتر مرثیہ نہیں پڑھ سکتا"۔

واقعی مرحوم سر سبز اپنے کلام کی جیسی داد لیا کرتے تھے جس میں طرز ادا کا بالکل لگاؤ ہوتا تھا اہل مجلس کے اشتیاق کی یہ صورت ہوتی تھی۔ کہ ہمہ تن محو سماعت۔

درسامی ایک مرثیہ کا ذکر ہے کہ شدید گرمیوں کا زمانہ ہے۔ آفتاب نصف النہار پر ہے اور رشید جو بائیس رجب کو امام باڑہ اکرام کلاں میں نیا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ گرمی کی یہ حالت کہ تمام اہل مجلس پسینہ میں غرق عرق۔ دستی پنکھے چل رہے ہیں۔ مگر پھر بھی بمصداق "باد زنہ دست بر دست ہمہ۔ در دم او باد بدست ہمہ" تسکین نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں انسان کیونکر اطمینان سے سن سکتا ہے۔

رشید نے بھی رنگ مجلس پہچان لیا۔ اور اختصار کرتے کرتے ایک دفعہ مرثیہ روک کے فرمایا "پنکھے رکھ دیجیے اور یہ تین چار بند سن لیجیے"۔ سبھوں نے فوراً پنکھے رکھ دیے۔ جس سے رشید کے کمال اور سامعین کی قدر افزائی اور کمال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور اہل کمال دورِ آصفی

آصف الدولہ کے وقت سے لکھنؤ میں ترقی علوم و فنون کی تاریخ شروع ہوتی ہے اور واجد علی شاہ مرحوم کے قیام تک ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ مدت سے رہنے سے موجودہ وقت تک بھی اہل کمال افراد کے وجود ہمارے نظر آتا ہے۔ مگر وہ وقت ہی اور تھا۔ اور یہ وقت اور ہے لکھنؤ میں اُس وقت کمال کی جو قدر تھی اُس کو زمانہ جانتا ہے۔ آصف الدولہ کی نگاہ قدر شناس نے گوارا نہ کیا کہ اہل کمال لوگوں کی خدمتوں کا صلہ نہ ملے۔ اور اشرفیوں کے توڑوں پر مہریں لگی رہیں۔ سخاوت کا عام میلہ ہو گیا اور یہاں رعایا کہ اُمرا کی پھوار آوے کے گرد و نکہ پہنچی۔ اور لوگ پھولے پھلے نظر آنے لگے۔

ایک عجیب سماں

ایک دوسرے متعدد واقعات کے حسن نے یہ واقعہ بھی کہن سال لوگوں کی زبانوں پر درجۂ تواتر رکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارا ولی نواب ہاتھی پر رونق افروز اپنی رعایا کی مختلف حالتوں کو اُن کی صورت حال سے مشاہدہ کرتا ہوا جوہری بازار سے گزر رہا تھا۔ شان یہ تھی کہ آگے آگے نہ تو کرکتوں کی گرجتی ہوئی آواز۔ نہ صدائے دور باش نہ ماہی مراتب نہ پس و پیش چاوش۔ پھر کیا تھا جو وقار شاہی کو نمایاں کرتا۔ اور جان نثار رعایا کو آداب شاہی بجا لانے کی طرف متوجہ کرتا۔ نہیں! نہیں!

شان و شوکت شاہی کی علامت تھی اور ضرور تھی۔ وہ یہ کہ چند سفید پوش چوبدار دست بستہ ہمراہ رکاب مگر خاموش۔ کہ اتنے میں ہودج سے ایک نرم آواز آئی "ہاتھی روکو" فیلبان نے فوراً تعمیل ارشاد کی پاؤں کی حرکت روک دی۔ انکس ترچھا کر دیا ہاتھی تھما۔ ارشاد ہوا "دیکھو وہ بڑھیا جو سڑک کے کنارے کھڑی ہے کیا چاہتی ہے" چوبدار دوڑا۔ دیکھا کہ ایک عجوزہ ایک لوہے کا ظرف لیے کھڑی ہے۔ سن تاریخ

نواب کے ہاتھی کی طرف سے جو خدا رسیدہ لوگیا کیا کرتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس نے
کہا تھا میں یہ سمجھتا تھا اگر بادشاہ کی نظر لوہے پر پڑ جائے تو سونا ہو جائے میں تو
مفلس ہوں۔ سمجھا تھا کہ آج بادشاہ کی سواری نکلے گی۔ اپنے مقدر کی آزمائش کے
لیے یہاں کھڑی ہو گئی۔ کہ دیکھوں میرا لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے یا نہیں"

جب داروغہ واپس آکر یہ حکایت ہوسر جمع ہمایوں تک پہنچائی۔ حکم ہوا کہ
وہ لڑکی ہاتھی اشرفیوں سے بھر دیا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ اس بڑھیا کو خزانہ شاہی
تک ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس کے طرفداروں نے یہ سکہ بادشاہ کا عمل کیا گیا +

"اے آصف الدولہ کاش یہ لکھنؤ تمہارے بعد کسی دوسرے نام پکارا جاتا"

علوم و فنون قدیمہ کے اعتبار سے ہندوستان میں ایک صدی سے زیادہ کا
عرصہ گذرتا ہے مگر لکھنؤ اور حیدرآباد میں اس کا تنزل اسی رفتار سے جاری تھا
اور ہے۔ حیدرآباد اگر اپنی حالت پر قائم بھی رہتا تو جائے تعجب نہ تھا۔ کیونکہ بفضلہ وہاں
کے اولوالعزم نواب اپنے ملک و قوم کی بہتری کو ہمیشہ مدنظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ اور
علوم و فنون کے معین رہے ہیں۔ مگر لکھنؤ کے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ باوجود اسباب
تنزل پیدا ہونے کے یہ سرزمین کاملین کو پیدا کرتی ہے اور اسی طرح شاید پیدا کرتی رہے گی
میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ میں ہوائے کمال ایک ہی طرح چلتی رہی۔ ہاں تغیر ہوا
اور ضرور ہوا۔ درخت کمال کی شادابی کے دراتع بالکل مفقود ہو گئے اس حالت پر بھی
شگوفے پھوٹے۔ مگر اس زمین خشک کی فطرتی نمی اُن کے رنگ و بو کو اچھی طرح ابھارنے
میں ناکامی ثابت ہوئی۔ بلکہ بہت سی کمزور کلیاں زمانہ کی گرم ہوا کی تاب نہ لا سکیں اور
کھل کھل کے مرجھا گئیں۔ چارہ کیا تھا۔ یہ سواد ہند کی قسمت +

لکھنؤ کمال شناس جدیا لے نہا۔ بساتو اب بھی ہے۔ مگر زمانہ۔ جمہور ہے
کمالات کی علی قدر نہیں کر سکتا۔ لیکن کمال حاصل کر۔ جو دا لے اشرافِ نفس ہو اُس
باجود اس کے کہ بے زری کا ایک بھاری پتھر اُس کی راہ روکنا ہے۔ اُن کی رفتار
جاری ہے۔ اور اپنی جگہ یہ سوچ کے مست ہیں۔ کہ

سخی کا اگر ہاتھ پورا نہ اُٹھا فقیروں کا بوریا بھی بھلا ہو رہا ہے

اب لکھنؤ اہلِ کمال کی کان ہے کانِ زر نہیں۔ جو قابلِ قدر نفوس اس وقت
ہیں غنیمت ہیں۔

ذیل میں رشید کے چند مرثیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

انتخاب مراثی

(مطلعوں کی فہرست)

۱ خلق میں ہو، وہ الطافِ الٰہی ہو علی

۲ ہو ارضِ کربلا سے مصلّٰی جو اب عرش

۳ جواں ہوئے علی اکبر جہاں سے جانے کو

۴ ہوا واشرطِ محبت تو حق ادا کی ہے

۵ کربلا میں دہم ماہِ محرم آئی

۶ یا حسین ابن علی آپ کا ذاکر ہوں میں

۷ میرا کلام کیوں نہ صداقت مآل ہو

۸ شاہِ ہر ماریہ میں ابرِ الم چھائے لگے

۹ محضرِ خونِ شہیداں ہو مرا دامنِ دل

۱۰ عباس نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی

خلق میں موردِ الطافِ الٰہی ہے علی

(بند ۱۱۳) در حال امام حسینؑ

دہم ماہِ محرّم کو قیامت آئی
شبِ عاشور گئی صبحِ شہادت آئی

سیہ شام سے تیرا ہے یہ نوبت آئی
پیشوائی کو قضا تا در دولت آئی

مستعد مرگ پہ ہر صفدر و غازی اُٹھا
کہ مصلّے سے محمد کا نمازی اُٹھا

طلوعِ صبح اور بہار

آمدِ صبح تھی اللہ کی قدرت کا ظہور
محو تھے طاعتِ معبود میں سب وحش و طیور

نظر آنے لگی ہر چیز جو نزدیک و دور
جیسے سیل آتی ہے اس طرح سے بڑھتا تھا نور

آشنا بحرِ سماوات کے سارے ڈوبے
موجزن نور کا دریا ہوا تارے ڈوبے

مدری سطر اور لطافتِ نظم

وہ ہوا سرد وہ سامانِ سحر چار طرف
اوس کھائے ہوئے شاخوں میں ثمر چار طرف

وہ نہائے ہوئے سارے گُل تر چار طرف
شرکے بھیگے ہوئے شبنم سے شجر چار طرف

جس نے جس جا کا کیا قصد وہیں پر پہنچا
کثرتِ گل سے نہ اک قطرہ زمیں پر پہنچا

اب ہیں سیدھے وہ تبسّم سے جو تھے کج کلاہ
دیکھے نرگس نے عجائب وہ جو تھے نادیدہ

گُل ہیں جیب جیسے ہو معشوق کوئی خوابیدہ
مرگِ گل سایہ میں مالیب ہیں مسی مالیدہ

دھنّا ہو گیا ہر ایک چمن جائے بہار
پھیل کر سایہ ہوا خیمۂ لیلائے بہار

ایسی سیرابی میں ہے نہیں جس کا ثانی
اس میں پوشیدہ کسی بحر کی ہے طغیانی

صفحہ دھویا ہوا ہو کھینچے جو نقشہ مانی
گل کی پتی بھی گرے تو کل آئے پانی

سرخ پھولوں سے عیاں خون ٹپکنے کو ہے
ساغرِ گل سے مئے رنگ چھلکنے کو ہے

داغ الفت نہیں بلبل کے جگر پر بھی ہیں گل
سر دیوار بھی گل باغ کے در پر بھی ہیں گل
سب زمیں پر بھی ہیں ہر ایک شجر پر بھی ہیں گل
اب تو گل پاؤں کے نیچے نہیں سر پر بھی ہیں گل

ایسی کثرت کبھی دیکھی نہ سنی پھولوں کی
آسماں بن گیا پھولوں کا زمیں پھولوں کی

ہیں تنومند شجر باغ میں سیاری ہے
آج کل فصل بہاری بھی مگر ساری ہے
ہر شجر آئینہ ہو یہ حکم نیا جاری ہے
فکس سے باغ کے دیواروں پہ گلکاری ہے

منہ نقابوں سے ہیں سب اہل حیا کھولے ہوئے
گل ہوا کھا رہے ہیں بند قبا کھولے ہوئے

امام حسن رضی اللہ عنہ اپنا مال و جان سب کو حوالہ کرتے ہیں

باجے بجنے ہیں صف آرا ہے ادھر لشکر شام
بیٹھے ہیں کرسی زریں پہ شہ عرش مقام
ہیں طلبگار رضا گرد ہیں انصار تمام
آپ منہ دیکھ کے ایک ایک کا کرتے ہیں کلام

اب ذرا دھیان ہمیں ہے مری غمخواری کا
بھائیو تم کو تو دعوے ہے وفاداری کا

چھوڑتے ہو مجھے اس وقت میں تم لوگ کیا
عرض کرتے ہیں شہ اے عزت ارباب وفا
ہم نمک خوار نہ ہوتے کبھی قدموں سے جدا
آج عزت ہے اسی میں کہ ہوں آقا پہ فدا

خلق میں لاکھ برس کا بھی جو سن آئے گا ٭ اس سے بہتر نہ کوئی مرنے کا دن آئے گا۔

شہادت و عزم تنہائی حسینؑ

بعد انصار عزیزوں کی جو باری آئی
شاہ کو حیدر صفدر کی وغا کو لائی

آج تک ذکر ہے یوں سب نے تنہا پائی
ہٹ گئے بھانجے فرزند بھتیجے بھائی

اور پھر کوئی مونس نہ شہیدائی تھا
بس فقط آپ تھے اور عالم تنہائی تھا

امام حسینؑ اپنے شریعت لائے ہیں اور عالم تنہائی میں لوگوں سے کلام فرماتے ہیں

روکے ارشاد کیا اے میری خواہرو بہن
مجھ سے سب چھوٹ گئے میرے مددگار ہیں

کوئی دم اور ہوں میں بیکس و تنہا بہن
اب مرے حلق پہ چلنے کو ہے تلوار بہن

وقت آتا ہے وہ نزدیک کہ لٹ جاؤ گی
جلد محمد بیکس و ناچار سے چھٹ جاؤ گی

محمد خواہر سے اس کا جواب

بولیں پیارے مرے بھائی تو صدقہ جاؤں
خشک ہیں ہونٹ سے لب پانی کہاں سے لاؤں

دل کا جو حال ہے اس وقت کسے دکھلاؤں
چل کے میں تیرے عوض برچھیاں کھاؤں

پھر وہی رونق گلزار محمد ہو جائے
مجھ کو موت آئے مگر تیری بلا رد ہو جائے

امام عالی مقام گہوارہ علی اصغر کے قریب آتے ہیں اور پیاس سے جاں بلب دیکھ کر اس شش ماہہ کو طلب آب کی غرض سے میدان میں لانے کا قصد فرماتے ہیں۔

ماں کی محبت اور دودھ شیر خوار

کہا بانو نے بہت خوب ہے شاہ دلگیر
لیکن اک عرض کروں گر ہو میری تقصیر

ان میں ہے دھوپ کڑی اور مرا بچہ ہے صغیر
دوسرے آہ ہیں فوج ستمگار سے تیر

شہ نے فرمایا کہ خود تیر ستم کھاؤں گا
ان کو دامن میں چھپائے ہوئے لے جاؤں گا

میدان علم اور سوال

نکلے خیمہ سے عجب یاس سے سلطان انام
دست زیں ایک بلندی پہ کہا آکے مقام

لیکے ہاتھوں سے ترا یا طرف لشکر شام
کھول کر منہ علی اصغر کا کیا شہ نے کلام

آن کر دیکھ لیں اور سوکھے ہوئے لب دیکھیں
تم میں جو صاحب اولاد ہیں وہ سب دیکھیں

شہادت علی اصغر

رو دیئے بعض پشیماں ہوئے بعضے دلگیر
حرملہ سے پسر سعد سے کی یہ تقریر

زنگ اچھا نہیں کر قطع کلام شبیر
اس ستمگر نے بڑا ظلم کیا مارا تیر

باغ جنت میں ہر دل فاطمہ سے تیر جدا
حلق اصغر کا جدا ماں سے شبیر جدا

منقلب ہو گیا ہاتھوں پہ وہ نور شاہ
صبر نے روک لیا آ گئی تھی لب پہ آہ

دیکھ کر حرملہ کی ہمت کو آپ نے واہ
یہی لازم تھا یہی چاہیے سبحان اللہ

[illegible] اب اس کو یوں ہی دیتے ہیں
پانی جو مانگے سو اب اس کو یوں ہی دیتے ہیں

کہہ کے یہ اصغر ماہ اس کو سنبھالا شہ نے
روئے لیکن نہ کیا زور سے نالا شہ نے

غیظ آیا تھا کیا رحم کہ ٹالا شہ نے
ماں کو اس نعمی سی گردن سے نکالا شہ نے

نکہت غنچہ گل تھی کہ چمن سے نکلی
روح بھی تیر کے ہمراہ بدن سے نکلی

کر کے تیار لحد روئے بہت سرور دیں
فاتحہ پڑھتے تھے ماہ شہ عرش نشیں

ٹیک کر تیغ کے ٹکڑے ہو گئے فوجیں جو تھیں
لے تربت کی طرف نعش کے دل ہی غمگیں

تم گئے ہم بھی ہیں دنیا میں مسافر اصغر ✽ مرے جاتے ہیں خدا حافظ و ناصر اصغر

امام آمادہ جنگ ہونے میں

کہہ چکے یہ تو نظر مڑ کے سوئے لشکر کی
ہو گئی اور ہی کچھ شکل شہ صفدر کی

غیظ دیکھا تو سیہ شام کی پیچھے سر کی
ہاتھوں سے جھاڑ کے مٹی لحدِ اصغر کی

دل سے تا سر کے ٹھیرانے کو سینا پوچھا
زلفیں آراستہ کیں منہ کا پسینا پوچھا

رجعت اسپ

کمی جو مہمیز چلا مثلِ ہوا وہ سن سے
نہ خبر بھی ہوئی تا چرخ گیا یوں رن سے

مانگیں گورو کتی تھیں لپٹی ہوئی گردن سے
روح مومن کی نکل جاتی ہے جیسے تن سے

تیز تگ کون ہے ہنگام تگ و دو ایسا
اپنے نعلوں پہ نہیں بوجھ سبک رو ایسا

سائے اس رخش میں ہیں ماہ بہاری کے اصول
پاؤں اس لطف سے رکھتا ہے کہ کھل جاتا ہے پھول

یہ فرس وہ ہے کیا ہے جسے سرعت نے قبول
آتے ہی فصل بہار اور ہی کچھ تھے معمول

دیکھنے سے قدم اس رخش کا دریا نکلا
نعل کیا اس کے بندھے پاؤں سے کانٹا نکلا

توصیف ذوالفقار لکھا اعمال روانی نظم

غور سے دیکھیے ہے شوق وغا اس کا نام
ہاتھ قبضہ پہ جو رکھتا تو اوگل آئی حسام

نصرتِ شاہ میں کرتی تھی اسے عمر تمام
میان کو کاٹ کے نکلی کہ اب اس سے کیا کام

صرف میداں جو ہو کیا کام ہے گھر سے اس کو
چھپکے جو بیٹھے بہادر نہیں کہتے اس کو

تا کفن آمادہ ہوئی زہر اگلنے کے لیے
خون میں ڈوبی ہے رنگ بدلنے کے لیے

روحیں تیار ہیں جسموں سے نکلنے کے لیے
راستے صاف ہوئے جاتے ہیں چلنے کے لیے

جاتی ہے جس کی طرف دوڑ کے وہ گرتا ہے
جس طرف پھرتی ہے یہ دستِ قضا پھرتا ہے

جوہرِ تیغ ہی یا سینہ کے زخم آئے ہیں
دل میں یاں سوزِ غمِ شاہ سے جا لے ہیں

دوش پر گیسوئے پُر پیچ گر ڈالے ہیں
ہار پھولوں کے ہیں یا موتیوں کے مالے ہیں

سائے اس سیف میں جوہر ہی سراسر نکلے
تیغ کیا نکلی فقط میان سے جوہر نکلے

دل کو مرغوب جو ہیں جوہرِ تیغ بُرّاں
اس کی خواہش میں گرے پڑتے ہیں سر جوں

دیکھ کر اُس کو ہمیشہ رہے اعدائے جاں
ان دکانوں پہ رہا خوں کا سودا ارزاں

یہ وہ بازار ہی عادل نے جسے کھولا ہی
تیغ یہ وہ ہی یداللہ نے جسے تولا ہی

ہی گراں ایسی سنبھلتی نہیں جس کی جھکیں
تیز دم ایسی کہ سو کوہ نہ جس کو روکیں

شیر دل ایسی بگڑ جائے جو اعدا ٹوکیں
سربلند ایسی کہ چھلتی ہیں فلک میں نوکیں

جاں ستاں ایسی کہ جیسے کی قسم لیتی ہی
جانیں لے لیتی ہی اعدا سے تو دم لیتی ہی

جب کیا وار ہر ایک اہلِ دغل بیٹھ گیا
یہ پڑا بوجھ کہ سب فوج کا دل بیٹھ گیا

بولی غصہ سے اجل جب کوئی پل بیٹھ گیا
بے حیا کھانے کو تلوار کا پھل بیٹھ گیا

کیا عجب اس کے جو دستِ شہِ صفدر اُٹھے
خلق باقی نہ رہے فتنۂ محشر اُٹھے

ڈرتے ہیں سب اسے کچھ ایسی ادا آتی ہی
ہٹتی ہی پاس سے جب یہ تو قضا آتی ہی

ناز ایسے دلِ بسمل کو سکھا آتی ہی
اور اک ہاتھ ہمیں پر یہ صدا آتی ہی

بڑھ کے آب اس کی بلاخیز ہوئی جاتی ہی ۔ باڑھ سے مل کے ہوا تیز ہوئی جاتی ہی

رضا لکھنوی

محو تھے جنگ میں کیا یہ سلطان انام
لائے جبریل امیں وصل خدا کا پیغام

ملک الموت نے پہلو سے کیا جھک کے سلام
ہونے آنے لگی یہ قلب کو آیا آرام

شہ عشق ترا سرور اکرم بھولے
دل کو جوش آگیا سلطان دو عالم بھولے

دل حسینؑ کا حال سات رہا

لائے تشریف میں پر جو شہ عرش بنا
آپ کے پالنے والوں کو ہوا غم جاں کا

دوڑے جبریل امیں کہتے ہوئے بسم اللہ
باغ فردوس میں نکلی دل زہرا سے آہ

چشم انور سے بہائی ہوئی دو رات کٹیں
قصر میں احمد مختار کے بے تاب کٹیں

عرش کی دوڑ ہے جلدی کہ قیامت آئی
آپ کے پیارے نواسے نے شہادت پائی

کہا حیدر سے غم و رنج کی بدلی چھائی
بولی جلد خبر لو ہے دم تنہائی

اس سے لڑنا اس وقت جو ہو صاحب
وقت مشکل کا ہے تم عقدہ کشا ہو صاحب

بولیں شبر سے کہ بھائی کی مدد کو جاؤ
ساتھ کھیلے ہو دل اس وقت ذرا بہلاؤ

اے مری جان اگر قصد ادھر کا پاؤ
زخم کاری ہیں سنبھالے ہوئے یاں تک لاؤ

نہ نزدیک بہن جان جو کھونے کے لیے
کہو صدقہ گئی ماں آتی ہے رونے کے لیے

اس کے جینے کی مجھے صبح سے باقی نہیں امید
ساتھ جو لوگ تھے سب آگئے وہ مرے پاس

ہو چکے اس سے جدا قاسم و اکبر عباس
جب سے آیا علی اصغر مجھے دونی ہوئی یاس

عاشق زار بہن رنج سے مرتی ہوگی ✽ ہائے کیا جانیے کیا اس پہ گزرتی ہوگی

ہی ارض کربلائے معلی جوابِ عرش

۱۲۰ بند (در حالِ امام حسینؑ)

وقار امر مقدسہ

ہی ارض کربلائے معلی جوابِ عرش
ہر ذرہ اس زمیں کا ہی آفتابِ عرش

پائے نہ اس کی گرد کو بھی آفتابِ عرش
جس کا غبار اُڑ کے ہوا ہی حجابِ عرش

وہ جائے فخرِ جنت عنبر سرشت ہے
کیونکر کہوں بہشت کہ رشکِ بہشت ہی

صحت آسا روضۂ مقدسہ

روشن ہی آستانۂ شبیر کس قدر
چوکھٹ کسی کو صاف آتی نہیں نظر

کہتے ہیں ایک نور کا خطہ زمین پر
ہاں ہی یہ حدِ روضۂ سلطانِ بحر و بر

اعدا نہ آنے پائیں یہاں کید کے لیے
زنجیرِ در بنی فقط اس قید کے لیے

تعریف زنجیر گنبد

زنجیرِ بست دیکھ کے کرتے ہیں سب بیاں
یہ موجِ بحرِ عفو ہی لیکن نہیں رواں

یہ بھی ہی ایک معجزۂ شاہِ انس و جاں
ہوتا ہی دور سے خطِ پیچیدہ کا گماں

بولا یہ جس کو کاہکشاں کا گماں ہوا
لوحِ جبیں سے خطِ مقدر عیاں ہوا

توصیف حوض

تسنیم دیکھے حوض تو ہو قصدِ ترکِ لاف
کوثر سے لاکھ درجہ ہی بہتر خطا معاف

ہیں سب کنارے صورتِ آئینہ خشک صاف
پیاسے موئے ہیں پیے اُتر نہیں خلاف

ہی طور حوض میں مئے بخشش کے جام کا
دھوکا ہی پیریوں پہ لبِ تشنہ کام کا

کلس و گنبد

جنبش نہیں کلس کو یہ ہی شاہ کا ادب
گنبد یہ ہی چمک کہ ٹھہرتی نظر ہی کب

سمجھے ہیں اُس کو قبۂ نورانی سب
پہلے یہ تھا سفید مگر اب ہوا ہے اب

نقشہ ہے بحرِ قدرتِ حق کے حباب کا
اُس کو رنگا ہے کاٹ کے زنگ آفتاب کا

پردہ
پردہ چھٹا ہوا ہے نئی ہر مثال ہے
ماں والدین کا سب کو خیال ہے
منہ پر حزیں کے دامنِ ملال ہے
اُترا ہے کب یہ وجہ سے فرحت کا سال ہے

پردہ منہ دھا ہے کب نہ گئی عقل ایک کی
پیچیدہ فرد رکھتی ہے اعمال نیک کی

رکاوٹ
ہر شب کو روشنی کا سماں ہے کہ واہ وا
جنت میں جس طرح ہو دلِ عارفِ خدا
قندیل میں چراغ ہیں کس کو جو ڈھونڈھا
سمجھیں بھی ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہیں دعا

عرصہ ہوا ہے پیاس میں شہ کو مرے ہوئے
ہیں ہر لگن میں شمع کے آنسو بھرے ہوئے

صریح الدور
ہے جلوہ گر حضرتِ شاہِ بحر و بر
ہیں جالیاں کہ آنکھیں ہیں سہرے ہیں یا نگہ
زائر بیان کرتے ہیں آپس میں دیکھ کر
گویا کہ دیکھتا ہے یہ کوئی ادھر

شبیر تیر کھا کے مرے یہ نشان ہے
جسمِ مشبک شہ والا کی شان ہے

معاملہ کربلا
دلِ اشتیق
دسویں کی صبح تک تھے عزیز و اقربا
ماں کا ایک ایک سے ملنے لگی قضا
کم زندہ اب ہوا شاہ کا دیدار گر تھا
کوئی رہا نہ پاس بجز ذاتِ کبریا

ساری بضاعتِ شہِ ابرار لٹ گئی
تھی دوپہر قریب کہ سرکار لٹ گئی

تھا جو قاتل وہیں تھا اُس سے پوچھو
خوں جس کا بے گناہ تھا اُس سے پوچھو

جو سو طرح کے ظلم سہے اُس سے پوچھو
موسیٰ جسے کہتے تھے اُس سے پوچھو

سوچو ہو یہاں جس سے وہ ایذا گذر گئی
اُفتاد سوچئے تو سہی کیا گذر گئی

آئے درِ خیام پہ شاہِ انام
ہر سمت حشر ہو گیا دوڑے حرم تمام

جلاد کے بیکسوں کو کیا آخری سلام
زینب نے آگے بڑھ کے کہا دو سے کلام

خیمہ میں آکے محاسنِ ماتم کو دیکھ لو
ہم تم کو بھائی دیکھ لیں تم ہم کو دیکھ لو

اہلِ حرم کو حکم صدا دو سے جدا کرنا تھا یہاں آ آتھی۔

مُنہ کو پسر کے کان کے نزدیک آپ لائے
کچھ اپنے دل کا حال کہا رخ پہ رخ دکھائے

کیں کچھ وصیتیں تو کچھ اسرارِ حق بتائے
کہہ کر اُٹھے لعنت ہے تم کو خدا بچائے

جب ہوا کیلئے دل یہ بہت بھر گئے جو
خالق ہی ساتھ صابروں کے صبر کیجیو

ظلمِ اعداد دیکھ کر جناب زینب بھائی سے کس طرح کے الفاظ میں فرماتی ہیں

کیا کیا ہمارے بارے میں فرما گئے رسول
پوچھے کوئی کہ ظلم و ستم سے ہے کیا حصول

افسوس جلد بھول گئے ظالم و جہول
اچھا انھیں ہماری حکومت نہیں قبول

حاکم نہیں یہ فاطمہ کی بیٹیاں تو ہیں
ہم شاہزادیاں نہیں سیدانیاں تو ہیں

خیال حالی مراد سے حضرت زینب کو غش آگیا

زہرا کے نورِ عین نے دہن کی ہی جو ہوا
جلدی سے آنکھیں کھول کے بولیں بہن خدا

جھک کر بہن بہن جو کہا ہوش آگیا
تدبیر کیا کروں کہ نہ تم مجھ سے ہو جدا

حاضر عوض تمہارے یہ مستِ مول ہے
بچ جاؤ تم تو مجھ کو نہایت قبول ہے

رخصت اور حسین کی ساری مہمی سکینہ

اس ذکر میں سکینہ نے بڑھ کر کیا بیاں
مرنے کا قصد کر لیا کیا اے شہ زماں
فرمایا ہاں خدا کی قسم اے پدر کی جاں
وہ کیا کرے نہ جس کا ہو ناصر نہ مہرباں

بولیں بچا کے ظلم سے اعدا کے بھیج دو
بابا ہمیں مزار پہ نانا کے بھیج دو

اہل حرم سے رخصت ہو کے شاہ عالی جناب عازم رزمگاہ ہوتے ہیں

عزم جنگ

گھوڑے کے پاس آئے شہنشاہ لاجواب
جبریل نے سوار کیا تھام کر رکاب
بیٹھے فرس پہ تن کے تو بیری ہوئی شتاب
آیا دمِ زوال بلندی پہ آفتاب

دیکھا سپاہِ شر کو غضب کی نگاہ سے
صاف آئی الاماں کی صدا رزمگاہ سے

رخصت فرس اور مکالمہ اعدا

رکھا جو ہاتھ باگ پہ بجلی بنا فرس
چاہا بہت ہوا نے تن اس کا نہ ہو مس
چاروں قدم براق کے رفرف کا پیش کس
اڑ جاتا عرش تک جو نہ کہتے حسین بس

اس گرم رو کے نقش قدم ہیں جو راہ میں
گویا چراغ جل رہے ہیں رزمگاہ میں

یہ قصد ہے دبوں گا نہ فوجِ شقی سے میں
تلوار کیوں کھنچے صف الٹ دوں ابھی سے میں
تھم جاؤں گا اشارہ شاجری سے میں
جز ضبط مصطفےٰ نہ رکوں گا کسی سے میں

اس سر بلند سے ہے زمانہ دبا ہوا
دانتوں میں غیظ سے ہے دہانہ دبا ہوا

چلتا ہی مثل تیغ دو دم وقت وار و گیر
آتا ہی رن میں تیر سا گو آ رہے ہیں تیر

اُڑتا ہی برچھیوں نیزوں سے گرد کے ہیں تیر یہ
سینہ سپر ہی بہرِ شہنشاہِ بے نظیر

کس سے میں سر کو دُم سے ملایا ہی جان کے
کھینچے ہیں یوں ملیں گے نہ گوتے کمان کے

توصیف تیغ آبدار

تیغِ علی ہی اور کمر شاہِ خوش خصال
لو وسطِ آسماں میں نظر آتا ہی ہلال

ہی یہ تگوں کہ فوجِ ستم ہوگی پائمال
جان اب نہیں بچے گی یہ سب کو ہوا خیال

سوئے سقر ہر ایک عدو دوڑنے لگا
مضطر ہوا رگوں میں لہو دوڑنے لگا

دُنیا میں صورتِ تن و جاں ہیں نیام و تیغ
گویا ہوں۔ تو زبان و دہاں ہیں نیام و تیغ

گل اور نبوئے باغِ جناں ہیں نیام و تیغ
قلعہ وہ لائے شاہ زماں ہیں نیام و تیغ

دشوار ایک دم ہی ٹھہرنا نیام میں
پنہاں ہی جوہروں میں کہ ماہی ہی دام میں

معرکہ حضرت سے فوج عدو کا حال سیاہ

اُکھڑے پڑے ہیں جتنے نشاں تھے گڑے ہوئے
دریائے فوج شہر میں تلاطم پڑے ہوئے

ہیں بے حواس بدر و اُحد کے لڑے ہوئے
سردار سالے کاپ رہے ہیں کھڑے ہوئے

ہیبت سے ابنِ سعد کا دل پائمال ہی
خیمہ میں ڈر سے دوڑ رہا ہی یہ حال ہی

ایک پہلوان جنگ کو سہما آہنی جیل کے ہاتھ سے مارا جاتا ہی

فوجیں جو ہٹ گئی ہیں کھڑے ہیں امام میں
پرغلیظ سے چڑھاتے ہیں کرنے کی آستیں

دامن سے پونچھتے ہیں رُخِ پاک اور جبیں
اُس پہلوان سے طالبوں نے منتیں حو کیں

کہہ کے چلا کہ سہل سے سر کاٹ لاؤں گا ہو مشکل کوئی پڑے گی تو میں بھاگ آؤں گا

چمکا کے اُس کو سبط نبی نے دکھائی تیغ
جھکا لعیں کہ شاہِ امم نے لگائی تیغ

جھپکی پلک کہ تا بہ زمیں جا کے آئی تیغ
بھی خبر اُسے نہ ہوئی کس نے کھائی تیغ

اُس میں بھرا نہ خون سنمگار دو ہوا
کیا ہاتھ صاف تھا مع رہوار دو ہوا

وقتِ شہادت قریب ہے شاہِ ولی نگار یاد اعزا و انصار فرماتے ہیں کیا بیکسی کا عالم تھا۔

فرمایا مجھ حزیں کی دعائیں کہاں ہیں آئیں
میری جبر بیٹے مدائیں کہاں ہیں آئیں

قلب و جگر سے تیر نے نکالیں کہاں ہیں آئیں
گرتا ہوں مجھ کو جلد سنبھالیں کہاں ہیں آئیں

آفت کا سامنا ہے مصیبت کا وقت ہے
ہیں کس طرف رفیق رفاقت کا وقت ہے

جواں ہوئے علی اکبر جہاں سے جانے کو

مسدس ۱۶۰ (حال علی اکبر)

حدا علی اکبر کا

ملائیں لیتی ہے چہرہ کی زلفِ عنبر بو
سفیدۂ سحرِ عید ہے بیاضِ گلو
ہزار آئینے صد قہ وہ سہ لقا پہلو
کھرے ہیں زورِ علی سے بھرے بھرے بازو

حسد کا نام ہی جس میں نہیں وہ سینہ ہے
خدا ہے جس پہ دلِ شاہدِ یقیں وہ سینہ ہے

ہے ہمسائی انکھوں کے تارے پھولوں کے دلبا
حدیث سے بھی جبر و آ حافظِ قرآں
تارِ تسبیح کے بھی با مدخوبیا ابا
شمارہ حامد ہے ماتھے پہ سجدہ کا ہے نشاں

جہاں تمام قیادہ شہر رسالت کا
رگوں میں خون کی جا مادہ امامت کا

حضرت علی اکبر کی جوانی اور دل میں ماں کی مسرت ماں کا استحسار اور اس پر جواب ہی اسم کا سوال امیر جواب

سلیقہ جاتے وصل کے چچا سکھانے لگے
ہر ایک کو قدر اندازیاں دکھانے لگے
ہوا جو تک دل ادا کے زخم کھانے لگے
ریاض تیغ کیے تھے وہ سب سکھانے لگے

اُمنگ دل کی جوانی کے ساتھ بڑھنے لگی
کمان کھینچنے لگی آسمن چڑھنے لگی

جو پوچھتی تھی کبھی بابوے امام رہا
یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا ہے جنگ کا ساماں
تو عرض کرتے تھے یہ دست بستہ اے اماں
تمام اہل جہاں ہیں عدوئے شاہِ زماں

عوض میں شاہ کے شمشیر و تیر کھائیں گے
لہو پدر کے پسینہ پہ ہم بہائیں گے

ماں کی سانس

وہ کہتی تھیں کہ مرے وضع دار کیا کہنا
سپاہیوں کو جراحت ہے پھولوں کا گہنا

اور قبیلہ کی اُمم کی شجاعت کا اظہار

اُمید دل کی بر آنا ہے خون کا بہنا
ہمیشہ سینہ سپر آگے باپ کے رہنا

جو تم نے پالی ہے عزت وہ کس نے پائی ہے
یہ بات وہ ہے جو کنبہ میں ہوتی آئی ہے

بعد سہاد حاضرین حضرت علی اکبر رضی اللہ عنہ چاہتے ہیں اور امام حسین علم اکبر خواہ دیتے ہیں

پھر سے جو لاشہ عباس سے امام انام
قدم پہ گر کے لگے رونے اکبر گلفام

کہا حسین نے کیوں کیا ہے میرے گل اندام
یہ جان تک ہے نثار آنے کر تمہارے کام

وطن سے دور ہوں آفت نصیب ہوں بیٹا
جہاں کا شاہ ہوں اور یوں غریب ہوں بیٹا

کہا انھوں نے کہ ہیں آپ صاحب ہمت
میں چاہتا ہوں کہ اب مجھ کو دیجیے رخصت

تڑپ رہا ہوں پیے سیر گلشن جنت
رہی نہ تاب جو دل کو تو بول اٹھے حضرت

خیال مرگ تو اے میرے لال ہے تم کو
پدر ضعیف ہے یہ بھی خیال ہے تم کو

ہمارا حق بطرف ہے یا نہیں اے لال
تمام بحث جگر ران میں ہو گئے پامال

نہیں بیان کے قابل جو کچھ ہے دل کا حال
تم ایسے وقت میں رخصت کا کر رہے ہو سوال

مقام غور ہے انصاف سے گزرتے ہو
ذرا سمجھ کے کہو کیسی باتیں کرتے ہو

ہم ایک بات بتائیں اگر کرو منظور
جو دل میں جنگ و جدل کا ہے شوق میرے غیور

تو ان سے لڑ کے نکل جاؤ ایک سمت کو دور
ہمیں تو کام ہے اُمت کا جان دینگے ضرور

ہمارے قتل کی احباب کو خبر دینا
پدر کی لاش کو پھر آ کے دفن کر دینا

بعد حصول رخصت جناب علی اکبر میں تسلیم لاتے ہیں اور جناب زینب محب اکبر الفاظ میں تعریف و تنقید کا اظہار فرماتی ہیں زبان اور طور گھلو قابل دید ہے

محل سرا میں جو داخل ہوئے علی اکبر
زمیں پہ دھوپ میں بیٹھی تھیں زینب مضطر

یہ سلام جھکے سینہ سے لگایا سر
کہا میں سمجھی طلب گار دادن ہو دلبر

بدن سے رخصت جاں کا پیام لائے ہو
پھوپی کے دل کی تڑپ دیکھنے کو آئے ہو

نثار ہو گئی بے جا ہے تم کو سمجھانا
کہ ہو خدا کی عنایت سے عاقل و دانا

ابھی نہ ذکر جدائی زبان پر لانا
پھوپی کی قبر بنا لو تو مرنے کو جانا

ہوئی ہی بار جوانی جو مرنے جاتے ہو
ریاضتیں مری کیوں خاک میں ملاتے ہو

خدا کی شان ہے دل سے آپ خود مختار
چلے ہیں مرنے کو میداں میں باندھ کر تلوار

لحاظ اب نہ کروں گی کہ آ رہا ہے پیار
کہوں گی لفظ خلاف مزاج اے دلدار

یقیں ہوا کہ محبت کا تم کو جوش نہیں
برا نہ مانیو واری کہ مجھ کو ہوش نہیں

جوان ہوتے ہی کیسے بدل گئے فی الفور
کبھی تمہاری محبت کا مجھ سے تھا یہ طور

نگاہ اور ہے آج آنکھ اور تیور اور
تم اور ہو گئے بیٹا۔ اگر کرو کچھ غور

یہ حال تھا کبھی دم بھر جدا نہ رہتے تھے
وہی ہو تم جو پھوپی جان مجھ کو کہتے تھے

میں کون ہوں مجھے پہچانتے ہو تم واری
ابھی سے بھول گئے میری محنتیں ساری

ہوئے جوان ملی فوج شہ کی سرداری
یہ سب امور تھے گویا سفر کی تیاری

[illegible]

حباب سب ورمائی ہیں

اگر یہ جانتی میں تم کو پالتی نہ کبھی
مگر جہاں میں بھتیجہ کو چاہتے ہیں سبھی

اگر یہی تھا تم الفت نہ مجھ سے کرتے کبھی
کرو یہ وعدہ تو دیتی ہوں تم کو رخصت ابھی

کہ ساتھ ساتھ سوئے فوج شام جاؤں گی
تمھیں ہٹا کے میں شمشیر و تیر کھاؤں گی

مزاج میں ابھی بچپن ہے اے شہ رسول
یہ ضد نہ کی کہ مرنے کے واسطے ہو ملول

مٹائے دیتے ہو کیوں رونق ریاض بتول
بھلا بسی ہوئی بستی اجاڑنے سے حصول

پھوپی کا نام ہے میرا نہ غم سوا ہوگا
بتاؤں اب ابھی سن پائے گی تو کیا ہوگا

یہ ضد ہے چاہنے والوں کے ساتھ گویا بیر
ریاض خلد میں جانے کو جانتے ہو سیر

بھلا میں غیر ہوں ماں باپ تو نہیں ہیں غیر
یہ جان لو کہ ہے دونوں کا خاتمہ بالخیر

خیال کچھ تمھیں بابا کی بیکسی کا نہیں
مثل ہے سچ کہ جہاں میں کوئی کسی کا نہیں

کوئی جواب دو قربان ہو گئی بیٹا
میں کہتے کہتے نڈھال ہو گئی بیٹا

جو بستی پہلے تھی ویران ہو گئی بیٹا
وہ صحبت اگلی پریشان ہو گئی بیٹا

ستم زدوں کو نہ تدبیر ہے نہ چارا ہے
بس اب خدا کا سہارا ہے یا تمہارا ہے

[illegible]
ٹھہر گیا طرف لشکر ستم جانا
ہوا ہے بھوک میں منظور بہر چھیا لینا

[illegible]

مصیبت پسر پر مادر علی اکبر کا تاسف

یہ سن کے بانوے ناشاد سے قرار آئی
ہوا ملال کہ ہونٹوں پہ جان زار آئی
سیہ لباس پہن کر وہ سوگوار آئی
قریب زینب ناچار اشک بار آئی

پسر کو دیکھ کے خاموش بھی رہا نہ گیا
بس ایک آہ تو کی اور کچھ کہا نہ گیا

اُٹھے سلام کو یہ گر پڑیں وہ تھرا کر
اُٹھیں سنبھل کے تو چلائیں اے علی اکبر
کہاں کا قصد ہے قربان ہو گئی مادر
جگر پہ تیر چلا دل پہ چل گیا خنجر

مرے دکھے ہوئے دل کو عبث دکھاتے ہو
مجھے بھی لیتے چلو گر جہاں سے جاتے ہو

ذرا بھوپی کی طرف میرے لال دھیان کرو
رضا کے واسطے منت نہ میری جان کرو
بس اب سوا نہ محبت کا امتحان کرو
جئیں گی بعد تمہارے نہ یہ گمان کرو

قریب مرگ ہیں کیا دیکھتے ہو حال ان کا
تمہیں قبول ہے صدقہ گئی ملال ان کا

[illegible]

سکینہ دیر سے روتی ہے پاس اپنے بلاؤ
بلائیں لینے دو اے لال منہ تو آگے لاؤ

غضب ہے ماں کا ضعیفی میں ساتھ چھوڑتے ہو
تھکے ہیں پاؤں ہمارے تو ہاتھ جوڑتے ہو

جواب علی اکبر حضرت حسین

جھکا کے سر کو یہ کہنے لگے علی اکبر
بھوپی کا آپ کا ارشاد تو بجا ہے مگر
یہ طرح سے [illegible]
[illegible] ہے اکیلے [illegible] مادر

[illegible]

حالت اہل حرم وقت وداع علی اکبر

چلے محل سے جو ہمراہ سرورِ ذیشاں
گلے سے لپٹی بھوپی اور کمر سے لپٹی ماں
پکارتی تھیں کہ ہوتا ہی آج گھر ویراں
خدا کی حفظ میں تم کو دیا علی کی اماں

بہار باغِ علی و بتول لے کے چلے
یہ پالنے کا صلہ ہی کہ داغ دے کے چلے

امام حسینؑ جواں اکبر کو مرنے کی اجازت دیتے ہیں اور کس جوش محبت سے ملاقات آخری کی بہم ادا فرماتے ہیں

جھکے جو جاؤ ادب سے ہیں گر بڑوں کہاں
خدا گواہ ہی طاقت کا مجھ میں نام نہیں
لگا دو سینہ سے سینہ تو دل کو ہو تسکیں
ملا دو ہونٹھ مرے منہ سے اور جبیں سے جبیں

لحاظ ہو تو کنول کب دلوں کے کھلتے ہیں
بس اس طرح سے ملو جیسے دوست ملتے ہیں

یہ کہہ کے جانبِ مقتل چلے شہِ والا
بس آگے بڑھ کے یہ مشکل مصطفےٰ نے کہا
نہ باہر آپ مرے ساتھ آئیے بابا
کہا امام نے مجبور ہوں میں اے بیٹا

[illegible]

یہ مجھ کو دل لیے جاتا ہی میں نہیں جاتا

حضرت علی اکبر کی جنگ

نہیں ہی تاب یہ اعدا کو ہی گلا دل کا
خطر کی موج نے کوٹا ہی قافلہ دل کا
لہو اُگلنے سے نکلا یہ حوصلہ دل کا
جگر کا خاتمہ ہی اور فیصلہ دل کا

عجیب عالمِ حیرت میں سب جفا جو ہیں
کہ ایک تیغ سے چو رنگ دونو پہلو ہیں

صیت تیغ سے رستم

دکھا رہی ہی چمک تیغ کی نیا انداز
دکھائی دیتی ہیں روحیں جو کرتی ہیں پرواز
نکل چلا کوئی بچ کر جو تفرقہ پرداز
لگا کے آپ نے اوجیسا سا وہی آواز

کہ زخمِ تیغ دو دم یادگار لیتا جا ✻ نشانی ایک تو اسے بدشعار لیتا جا

ایک پہلوان میدان میں کود آتا ہے اور حضرت علی اکبر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے

بڑھے تو مورچے لشکر کے دم بدم توڑے
پھر پرے پچھاڑ کے پھینکے ادھر علم توڑے
ہزارہا سرِ کفار کم سے کم توڑے
دکھا دی بُت شکنی مثلِ جدِ صنم توڑے

خدا کے بعد ہیں ہم سب کو یہ بتاتے ہیں
ہر ایک وار پہ تکبیر کہتے جاتے ہیں

یہ سُن کے آئی حیا تیغ لی بڑھا جلاد
غضب کے ہاتھ لگانے لگا ستم ایجاد
گزندان کو نہ پہنچی تو یوں کیا ارشاد
تجھے تو کچھ ہنرِ جنگ خاک بھی نہیں یاد

عیاں ہے صاف کہ دونوں پہ خوف طاری ہے
فرس کو روک سنبھل اب ہماری باری ہے

وفا سے دل ترا نامرد ہٹ نہ جائے کہیں
نظر نہ پھیر اُدھر وہ یہاں بٹ نہ جائے کہیں
ذرا جھلم نہ ہٹا چہرہ کٹ نہ جائے کہیں
جھجک کے نیغ سے گھوڑا الٹ نہ جائے کہیں

فرس کا ہے پس و پیش ایک یوں سمٹتا ہے
بڑھ آگے خوف سے کیوں دب کے پیچھے ہٹتا ہے

بڑھے یہ کہہ کے لگے چلنے جانبِ میدان
گھٹا یہ زور ہوا دست پاچہ ظلم شعار
لعیں کی انگلیاں کٹ کٹ کے گرتی تھیں ہر آن
ہوا یہ حال لگی گرنے ہاتھ سے تلوار

کہا انھوں نے جو زخمی اُدھر کلائی ہوئی
یہی تھی ضربِ ید اللہ کی بتائی ہوئی

ہوا دا شرط محبت تو جزا ملتی ہے

بند ۸۴ (در حال امام حسینؑ)

علم سر حسینؑ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا اور انداز بیان قابل ملاحظہ ہے

آ گیا خیمہ سے باہر شہ مرداں کا خلف
سب کو جوش آ گیا جرار بڑھے تیغ بکف
لشکر شام میں بجنے لگے ہر سو دف و دف
فوج اسلام میں تکبیر ہوئی بن کے صدف

شیروں کے نعرۂ شیرانہ سے رن گونج چکا
پسر شیر خدا سر علم کھول چکا

علم شاہ کی میدان میں ہے طرفہ بہار
بجلی گرتی ہے لعینوں پہ چمک کے ہر بار
آنکھیں ہیں بند گرے پڑتے ہیں ان میں دوار
صبح کے وقت کا ہونے لگا ہر جا اظہار

دم بدم یاں سے جو پنجہ کی ضیا جاتی ہے
دھوپ جنت کے درختوں پہ نظر آتی ہے

یہ علم فوج حسینی کے چمن کی ہے جان
باغ اسلام کی رونق ہے یہ پنجہ کی ہے شان
پانچ پتی کا کھلا پھول یہ ہوتا ہے گماں
گل صد برگ کی مانند سنہری ہے نشان

غازہ رنگ اس کا بنا حور کے چہرے کے لیے
پھول کھلنے لگے ہر باغ میں سہرے کے لیے

پوچھا بہن کو نہ ہمراہ ہوا دے لی
گرد کی پاک کہ تھی پانی کی چادر میلی
گل و بو کے لیے تشبیہ ہے محمل لیلی
پھول کھلنے کی خبر آئی کہ خوشبو پھیلی

علم شہ کے پھریرے کی یہ زیبائی ہے
عطر ملنے کے لیے فصل بہار آئی ہے

اس کا حامل ہے بہار چمنستان دھر
ہیں قوی ہاتھ کہ بے تیغ ابھی جھیل کے شہر

پھل سے شمشیر کے ظاہر ہے کہ قبضہ میں ہے نہر
لہر ہے سبز بھریرے کی کہ سبزہ کی لہر

شوق میں دور سے غلماں بھی اسے چومتے ہیں
جب ہوا جاتی ہے جنت کے شجر جھومتے ہیں

انصار امام شہید ہو چکے ہیں لشکر اعدا سازِ طلبی کر رہا ہے آ خیمہ میں بہر رخصت جاتے ہیں

دل سے فرمایا غم و رنج کے دفتر کھولیں
جس سے ہم چھٹ گئے جی کھول کے اُن کو رو لیں
چھائی ہے گرد الم آنسوؤں سے منہ دھو لیں
موت نزدیک ہے اب بہنوں سے رخصت ہو لیں

حال اندوہ سے کیا دیکھ آئیں
سب کو پھر ایک نظر مل کے ذرا دیکھ آئیں

آرزو تھی کہ سر تربتِ اصغر روتا
کبھی قاسم کے لیے گہ پیے اکبر روتا
بہر عباس علم دار یہ مضطر روتا
ملتی مہلت تو ہر ایک قبر بنا کر روتا

رہتا مشہور سدا خلق میں وہ غم کرتا
ہاتھ بے کار نہ ہوتے تو میں ماتم کرتا

کہہ کے یہ اور پریشاں ہوئے سلطانِ عرب
آ کے خیمہ میں صدا آپ نے دی اے زینب
کہو بیووں سے کہ ملنے کے لیے آئیں سب
کریں عابد سے بیاں دل میں جو کچھ ہے مطلب

اب امامت انھیں ہونے کو ہے ہشیار کریں
قصد ہے اپنی سکینہ کو ذرا پیار کریں

دوڑیں سیدانیاں خیمہ میں ہوا حشر بپا
سب کی سب آئیں قریں برقعہ سر برہنہ پا
شور ماتم ہوا جب دینے لگے شہ پرسا
غم یہ تھا زینب مضطر کے نہ تھے ہوش بجا

پاؤں پر جھک گئیں الفت سے دعائیں دیکے
گرد پھرنے لگیں بھائی کی بلائیں لے کے

شہ نے فرمایا کہ اس وقت جو اکبر ہوتے
اور اس طرح سے سر پیٹ کے ہم تم روتے

اے بہن اس سے سوا اشکوں سے منہ کو دھوتے
یا گلا کاٹ کے خود جانِ حزیں کو کھوتے

مل گئی خاک میں کیا چاند سی صورت اُن کی
حشر تک ہم کو نہ بھولے گی محبت اُن کی

[illegible]

وہی سیرت مرے نانا کی وہی شکل و شباہت
جو قبا پہنی ہوئی بیاہ کا گویا خلعت

کیسی پائی تھی رسولِ دو جہاں کی آواز
کان میں آ رہی ہے اُن کی اذاں کی آواز

نور آنکھوں کا اُجالا وہ مرے گھر کا تھا
اس سبب سے نہیں کہتا کہ وہ مرا بیٹا تھا

خانداں میں مرے جو تھا وہ بہن یکتا تھا
گو حسیں سب تھے مگر یہ تو نجانے کیا تھا

اک ہمیر سے سوا اپنا پسر دیکھ لیا
سُنتے تھے حضرت یوسف کو مگر دیکھ لیا

حرم سے برآمد ہونا حضرت کا

شاہِ دیں روتے ہوئے خیمہ سے آئے باہر
چور زخموں سے بدن سیکڑوں صدمے دل پر

کی نہ اجلا طرف کوئی آیا نظر
ضبط ہیں گھوڑے کو زین کے کھڑے تھے شبّر

ایسے [illegible]
تھامی زینب نے رکاب آ کے تو اسوار ہوئے

صفت اسپ جوش لوام

جم کے بیٹھے تو دلِ رخش نے راحت پائی
پاؤں میداں میں پٹکا یا تو قیامت آئی

شہ کو یاد آ گیا وہ قوت بازو بھائی
جوش میں لانے لگا اور غمِ تنہائی

[illegible] کو [illegible] کو

اسپ پہچان گیا عزم تہنتاہ انام
کر لیا قصد کہ پامال کروں کوفہ و شام

کام وہ بھیجیے جب لوگ ہیں رہ جائے نام
یوں چلا وہ جلتی ہے جس طرح حیدر کی سام

شیر کی طرح قریب صف ہیجا پہنچا
ایک ہی جست میں تا فوج ستم جا پہنچا

تلوار کی تعریف

یہ چلی جن یہ وہ جیسے کی قسم کھانے لگے
اور وہ جس سے قضا اور صفت چھانے لگے

آب ایسی ہے کہ ہر بحر میں موج آنے لگے
لیک ایسی ہے کہ دل برق کا تھرانے لگے

کب کسی دل میں دم جلوہ گری تھمتی ہے
کہیں شیشہ میں اثر کے یہ پری تھمتی ہے

نور عین علی اس وقت جو ہے مائل حرب
وہی خنجر ہے بعینہ ہے انھیں کی ہر ضرب

جسکو چھینے کے لیے مہر بھی ہے جا زم غرب
زلزلہ یہ نہیں ہے گاہ زمیں کو بھی ہے کرب

کروٹیں خوف سے رہ رہ کے بدلتی ہے زمیں
یا علی کہہ کے ہر ایک بار سنبھلتی ہے زمیں

رہتے ہیں جتنے فسن قلعہ خیبر کی طرف
ان میں ہے سعد کہیں لشکر ہے شاہ نجف

جس نے کاٹے پر جبریل اٹھ دی ہے صف
سن سے جاں ہوتی ہے جب غنچہ کی تلف

خوف اس مرتبہ ہے جان چلی جاتی ہے
اشتی تلوار کے چلنے کی صدا آتی ہے

فوجیں ہر ضرب پہ ہٹتی ہیں کہ ہٹتی ہے زمیں
گرد اٹھتی نہیں اس طرح اٹھتی ہے زمیں

پر بچھاتے ہیں جبریل کہ کٹتی ہے زمیں
غل فرشتوں میں ہے ہر بار کٹتی ہے زمیں

اس قدر مجھ کو ہے خوف کہ مٹھیرے ہے * آسماں دھنسنے کو چار طرف گھیرے ہے

ساقی نامہ

ساقیا اب تو میں اک جام لبالب لونگا
ایک دارہ کبھی ہو کم تو بھلا کب لونگا

جس طرح پہلے دیا ہے مجھے پھر اب لونگا
جام کیا شے ہے خم و ہستہ سو سب لونگا

ساقیا تجھ سا سخی خلق میں زنہار نہیں
جانتا ہوں کہ تجھے دینے میں انکار نہیں

دم بدم صورت دریا کرم ہاتھ بڑھے
سیکڑوں جام چڑھا جائے تیوری نہ چڑھے

نزع میں نشہ سے مملو ہوں یہ آنکھوں کے کھلے
سم خدا ہیں نہ پیمبر ہیں نہ لکھے نہ پڑھے

بعد اللہ و نبی ایک تجھے ماننے ہیں
دین اپنا تجھے ایمان تجھے جانتے ہیں

اس کے پینے سے نہیں رہتی شکایت کوئی
کہ نہیں رہتی نہیں عصیاں سے اذیت کوئی

نہ پیے یہ تو نہ مقبول ہو طاعت کوئی
اس سے بہتر نہیں دنیا میں عبادت کوئی

سجدہ ہر بار کروں مطلب دل پا جاؤں
دینے جا جام میں تسبیح پہ گنتا جاؤں

شہادت امام اور گریہ حباب

ہو گئے ذبح شہ دیں کئی ہر سمت خبر
ہو گئے سب حرم پاک زیادہ مضطر

گھر سے مقتل کو چلیں شہ کی بہن بے پردہ سر
بند آنکھیں کرو ایک شخص پکارا بڑھ کر

آبرو جانتے ہو غالب ہر غالب کی
بیٹی آتی ہے علی ابن ابی طالب کی

پہنچی نزدیک جو شبیر کے وہ شیدائی
رو کے چلائیں کئی مرتبہ بھائی بھائی

ہائے جلتی رہی میں تمنے شہادت پائی
تم کو گھیرے ہوئے ہے بیکسی و تنہائی

نئے انداز سے یہ دشمن دین لوٹتے ہیں
نہ سر بھی تن پہ نہ رہا یوں بھی کہیں لوٹتے ہیں

کربلا میں دہم ماہِ محرم آئی

بسنت ۱۰ (درحال عون و محمد)

آمد بہار اور پردہ شاعری میں مصیبت

نہ کسی نے خبر حالت یکسو بدلی
شرط آپس میں بہار آنے کی سب نے بدلی
باغ عالم کی ہوا اور ہوئی رُت بدلی
بوسدیاں پڑ رہی ہیں چھائی ہوئی ہے بدلی

خشک گل تر ہوئے پیروں کو جواں کرتا ہے
آبیاری چمن آرائے جہاں کرتا ہے

نام سامان ہے اب بے سر و سامانی کا
ٹوٹے فوارے بھی اور زور ٹھہا پانی کا
باغبانوں کو یہ موقع تھا نگہبانی کا
نام گلزار میں رکھتے نہ پریشانی کا

ہوں میں زینت کا سبب صاف یہی کہتی ہے
آج کل ہتوں میں سنبل کے چھپی رہتی ہے

باغباں کو ہوئیں مشکلیں آسانی میں
پھول بہتے ہیں حبابوں کی جگہ پانی میں
ہے عبث گیسوئے سنبل کی نگہبانی میں
لاکھ جمعیت خاطر ہے پریشانی میں

کشتی آکے کبھی تھم سکتی نہیں دھارے پہ
گر کے گل شاخ سے ٹھہرے ہے فوارے پہ

رنگ یہ دیکھ کے گھبرا گئے ریب کے پسر
مشورہ کرنے لگے وہ گلِ باغ جعفر
چل کے اماں سے کہو شہ سے کہیں ملوا کر
ہم کو مل جائے رضا پہلے فدا ہوں شہ پر

حضرت عون و محمد کو الفاظ ان کے یکے بعد دیگرے فائز شہادت ہونے دیکھ کر حضرت زینب کے فرزندوں کو بھی خیال نصرت حسین پیدا ہوا اور آپس میں یوں ہمکلام ہوئے

آج ہر اک گلِ امید جینے کا بھائی
دیکھنا کوئی ہماری نہ سنے گا بھائی

کہا عمیو نے نے بڑے بھائی سے ہاں علیہ
کہیے تو دیکھیے کیا کہتی ہیں اماں چلیے

عون محمد کی کسائے علم کی بیٹے کا اشتیاق واطہار کرنا اور حضرت امیر تعلم

اذن وہ دیں تو حضور نہ ذیشاں چلیے
پھر سوئے باغ بساں حرم و فرماں چلیے

پہلے سے فکر ہے جاہ و حشم بھی کیجے
گر سا سب ہو تو کچھ ذکر علم بھی کیجے

دونوں، کہے کہ جو گھر میں بولیاں آؤ
کہو کیا کام ہے کیوں آئے ہو تم جلد بتاؤ

عرض کی دونوں نے دل کہتا ہے ہرگز چھپاؤ
ہم علم لینے کو آئے ہیں کہا باہر جاؤ

مثل جعفر ہوئے ہے یا جعفر طیار ہوئے
واہ وا خوب علم لینے پہ تیار ہوئے

لاکھ صدموں میں گرفتار ہوں میں زار و حزیں
ہے اگر فکر علم تم کو تو لو جا کے کہیں

اس مرے دل میں محبت کا کہیں نام نہیں
کوئے تم دونوں کو کوئی تو کہوں میں آہیں

جا نہیں جا نہیں تو علم لینے کا قصہ جائے
بات رہ جائے جو اس وقت اجل آ جائے

محمد کو نے کے لیے صدمہ و غم کیوں آئے
چھوڑ کے خدمت سلطان امم کیوں آئے

دل میں پچھتاتے تو اب ہوگے کہ ہم کیوں آئے
رنج ہوتا ہے مجھے ذکر علم کیوں آئے

اب ہے ضد مجھ کو کہ تم دونوں کی ضد دیکھوں گی
بھائی دیں گے بھی اگر اب تو نہ دینے دوں گی

حضرت عباس کا اپنے بھائیوں سے علم طلب کرنا اور ان کا اسعاف علمداری کے وجہ بیان فرماتے ہیں

لو سنو مجھ سے وراثت کا اگر ہے دعوے
تم کو کیا بیٹھے ہیں صبر کہ تمہارے بابا

منتقل کر گئے خود شاہ رسل یہ عہدہ
دلبر حیدر کرار ہیں سلطان ہدا

وہ بھی وارث ہے طلب بھی نہ اگر پاؤں گی
گر خدا چاہے گا عباس کو دلواؤں گی

ہے غضب میرا غجالت سے نہیں اٹھتا سر
سامنے سب کے کہا تم نے جو تھا دل میں نظر

کیا تعجب ہے جو غصہ نے کہا ہو جا کر
ہو گئی ہو گی انھیں علم امامت کی خبر

مجھ کو شرم آتی ہے کیا سامنے جاؤں شہ کے
بات میری گئی تم پھٹ گئے بچہ کہہ کے

لاکھ سمجھایا انھیں کچھ نہ ہوا آہ سدا
باتیں یہ خوب نہیں دل میں سمجھتے نہیں

ہیں مشیت سے خدا کی شہ والا آگاہ
منہ سے اب نام علم کا نہ نکالو للہ

جتنے ہیں فخر شجاعان عرب مانگیں گے
رشتہ جن جن کو نبی سے ہے وہ سب مانگیں گے

عذر کیا ان سے کیا جائے گا کچھ بتلاؤ
ایسے بچہ نہیں لازم ہے مجھے سمجھاؤ

ہے علم ملنے سے بہتر کہ شہادت پاؤ
سرخ رو خوں میں ڈوبے ہوئے گھر آؤ

پاس ایک ایک کا کس طرح کیا جائے گا
عہدہ یہ ایک ہے کس کس کو دیا جائے گا

گوشہ چشم سے کرتی تھیں جو غصہ کی نظر
ہاتھ جوڑے ہوئے وہ کانپ رہے تھے تھر تھر

یہ خبر سن کے چلی آئی سکینہ مضطر
آبدیدہ انھیں دیکھا تو کہا گھبرا کر

شاہ کو ان سے ہے عشق اور وہ عاشق ہیں شہ کے
ہم دلا دیں گے تمہیں اپنے چچا سے کہہ کے

مسکرا کر کہا زینب نے کہ ناجی جی نا
وہ برا مانیں گے ہرگز نہ چچا سے کہنا

آبدیدہ ہیں تو کیا روئیں گے تو کیا ہو گا
تم تو ناداں ہو سمجھتی نہیں مطلب ان کا

ظاہر اگو علم شیر خدا مانگتے ہیں ❁ اسی پردہ میں یہ مرنے کی دعا مانگتے ہیں

صاحبزادے کے غصہ کی وجہ سے دونو صاحبزادے سہمے ہوئے کھڑے ہیں کہ جناب سکینہ آئی ہیں اور عہدہ علمداری کے لیے چچا عباس کی سفارش کا وعدہ فرماتی ہیں مگر جناب زینب انکار فرماتی ہیں

چھوٹے صاحبزادے محمد کی پیدائش و تقسیم علم و تیغ

کی یہ چھوٹے نے جسارت کہ کہا اے اماں
ہیں نبی زادے وراثت تو ہماری ہے عیاں

سچ ہیں بے شبہ کہو آپ نے جو امر بیاں
نانا دادا کے ہیں ہم ہیں آج نشاں

یہ بڑے ہیں انھیں لشکر کا علم دیدیجے
ہم لڑیں فوج سے اک تیغ دو دم دیدیجے

اسی سلسلہ میں حضرت سید کی مرثیہ خوانی

اک تعجب ہوا کی آپ نے جرأت سے نظر
دفعتاً حال ہوا ہو کوئی جیسے مشدر

ہاتھ مارا کبھی سینہ پہ کبھی زانو پر
پولیس میں سمجھی تھی لینا ہے علم رو دو کر

اب کھلا مرتبہ میں سب پہ یہی غالب ہیں
ذوالفقار اسد اللہ کے یہی طالب ہیں

رنج ظاہر ہو وہ شیم اور وہ ابرو کیوں ہیں
ہے خوشی مرنے کی تو آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں

کیوں پریشان ہو بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں
غم ہے کیا باتوں میں یہ درد کے پہلو کیوں ہیں

قاسم و اکبر و عباس کو سمجھا دو نگی
پہلے ان سب کے رضا مرنے کی دلوا دو نگی

امام حسینؑ حضرت عباس سے علم لیتے ہیں حضرت سید علم سے کے دیتے ہیں اور عباس علمدار باہر لے کے آتے ہیں

گفتگو کچھ ابھی باقی تھی کہ آئے شہ دیں
پھر کے فرزندوں کی جانب سے علم لینے لگیں

اور اشارہ سے کہا جا یہ ٹھہرنے کی نہیں
دے کے بھائی کو نشاں بولے شہ عرش نشیں

کمر میں جراروں کی اے ماہ لقا بند ہو اؤ
وہاں صفیں بند ہو گئی ہیں تم بھی پرا بند ہو اؤ

کر کے تسلیم چلا وہ دل و جان حیدر
تھی وہی شان علی اور وہی تھے تیور

در پہ حاضر ہوئے انصار پہنچی جو خبر
لے چلے آپ علم کر کے سلامی باہر

فوج اسلام کی تسلیم کو آمادہ تھی ✻ فضہ پردہ کو اٹھائے ہوئے استادہ تھی

ایسے بابا کی طرح یہ بھی ہیں خالق کے ولی
رشتہ ان دونوں کا ہے سارے زمانہ پہ جلی

ہوگا اک حشر بپا آج جو تلوار چلی
علمِ احمدِ مختار کے حامل ہیں علی

عزت اس سبز پھریرے سے بڑھی جاتی ہے
حضرتِ خضرِ عمامہ کے لیے جاتے ہیں

بڑھ گئے دل علم اس شان سے باہر آیا
فوج اللہ و پیمبر کو مسلح پایا

سر تبختر پہ عباس کے تھے سایا
واں سے سفت ہوئی حکم آپ نے بھی فرمایا

سینے تانے ہوئے سب صاحبِ شمشیر بڑھے
وجہ غصہ کی ہوئی زخم لگے شیر بڑھے

جا کے ایک ایک نے میدان میں کی خوب وفا
لڑکے مسلم کے یتیموں نے بھی کی جان میں قضا

خود گئے خلد میں اور نار میں فوجِ اعدا
جلد گھر میں گئے جانِ دلِ بنتِ زہرا

کہہ کے سب حال کہا شہ سے گزارش کیجے
وقت ہے وعدہ وفائی کا سفارش کیجے

کہا زینب نے کہ ہاں مجھ سے ابھی تو رخصت
کرو مظلوم حسین ابنِ علی کی نصرت

جلد سامان کرو چاہیے مشکل عجلت
آج تم زور سے تلوار کے لے لو جنت

مختصر کہتی ہوں جاتی رہے یا جان رہے
وضع کا اپنے بزرگوں کی ذرا دھیان رہے

سنتی ہوں ان میں کئی لاکھ ہے فوجِ ناری
بس اسی دن کے لیے تھی مری محنت ساری

تم بھی دونوں مددِ شہ کی کرو تیاری
آج کے مرنے کو مرنا نہ سمجھنا واری

دیکھو قرآن میں شہیدوں کا بڑا رتبہ ہے + پاس اللہ کے ہیں رزق انھیں ملتا ہے

بعد شہادت انصار حوں و محمد بھی سے معذرت چاہتے ہیں اور وہ بھی نصرت حسین کے لیے اجازت دیتی ہیں بہنوں کو دل ڈراتی ہیں اور مرنے شہادت بیان فرماتی ہیں۔

کہہ کے یہ زلفیں سنوارین اور دل اور داس
آنکھوں پر آب نہیں چہرے پہ ٹپکتی تھی یاس
تھا عیاں دل کے دھڑکنے سے غضب کا ہراس
دبتی جاتی تھیں پہنچ کے یہاں کو سبھی

دھیان آیا گلی امید، راب کھلنے کو
کمریں بند ہو کے کھڑی ہو گئیں خود ملنے کو

صفت رہوار

دوڑی یوں ساتھ ہوا گاہ گری گاہ تھمی
خاک کب اڑتی تھی تعظیم کو اٹھتی تھی جمی
یہ سبک چلنے لگے گرد ہموں پر نہ جمی
دیکھنے والوں کی سانس آنے میں کرتی تھی کمی

راہ میں طائر و ہم ان کو نہیں پا سکتا
تیز رو ہیں کہ پسینہ بھی نہیں آ سکتا

سر قلم کرنے میں بچوں کو بہت ہی تعجیل
ہوتی جاتی ہے چھپی بہت فنا فوج دلیل
شاہزادوں کا ہے حکم اس کی ہے واجب تعمیل
دونوں ہاتھوں سے ذرا کام کریں عزرائیل

ہیں اگر ہوش پراگندہ درستی نہ کریں
تیز دستی کا یہ ہنگام ہے سستی نہ کریں

دو رہوں کے دلیرانہ حملوں پر خاص زرہ کی اظہار تعریف

آئیں تھیں ٹیلوں کو پہنچا نے جو زینب جھجکیں
شور اٹھا جو سنا اپنی جگہ سے اٹھیں
بولیں فضہ سے کہ لو بھاگ گئے میرے لعیں
کہہ کے یہ بنت علی آ گئیں پردے کے قریں

آرزو تھی کہ یہاں لاشہ یہ لاشہ دیکھوں
میں تو دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھوں

بولیں جس دم وہ پھریرے کے نشاں جاں سے گئے
دیکھو دم بھر میں کیے دیتے ہیں لاشوں کے ڈھیر
اب تو پیچھے پڑے ہیں جھانکے پنجے مرے شیر
سب بزرگوں کے تصدق میں ہوئے اور دلیر

ہو گئے اتنے قوی نام جو دو میں سے لیے ✻ دونوں بچوں نے جوانوں سے علم چھین لیے

جب جھپٹتے ہیں وہ فوجوں پہ تو فرماتی ہیں ماں
کیجیو جان لڑا کر مدد شاہِ زماں

واہ وا اے مرے بچو انہیں خالق کی اماں
دودھ میں بخش چکی تم کو مبارک ہو جناں

میں دعا مانگتی ہوں فضل خدا کا ہو جائے
جس لیے تم گئے ہو کام وہ پورا ہو جائے

فوج اعدا کے اُن سخنوں کی وحشت ابن سعد کا خطاب اور پہلوانوں کا جواب۔

پہلوانوں سے ابن سعد لعین نے یہ کہا
دو جوان چھوٹے سے بچوں سے نہیں کرتے وفا

فوج تو بھاگتی ہے خیر ہوا ہے تمہیں کیا
گود میں ان کو اٹھا لاؤ جو رکھتے ہو حیا

وقت آجائے تو رستم سے بھی لڑ لیتے ہیں
لوگ تو گھیر کے شیروں کو پکڑ لیتے ہیں

بولے ہاں لڑتے ہیں جب ہوتا ہے سر زیر دلیر
تو کل فوج سے ہم ساتھ ہیں چل کر انہیں گھیر

پہلے جو بھاگے ہوئے جاتے ہیں اُن سب کو گھیر
ہم ہیں روباہ سے کم وہ اسد اللہ کے شیر

کفر و اسلام میں اوّل سے کبھی میل نہیں
جنگ ان بچوں سے دشوار ہے کچھ کھیل نہیں

یا حسین ابنِ علی آپ کا ذاکر ہوں میں

بند ۱۰۹ (در حال امام حسینؑ)

امام حسینؑ کی تشریف آوری

نکلے خیمہ سے مسلح جو شہنشاہِ عرب
اُٹھے سجادؑ سے تعظیم لیے انصاری سب

بعد تسلیم پھرے گرد تمام اہلِ عرب
شاہ کے ساتھ بڑھے سیر کو وہ پیش و عقب

سب ہنسے آئی نظر ایسی فضا مقتل میں
گلشنِ فاطمہ کے پھول کھلے جنگل میں

صبح کے دلفریب مناظر۔ اور کیفیتِ چمن۔ یہ چند بند اُن تمام شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہیں جن پر مغربی خیال کے حضرات کو وجد آتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ رشید کی طبیعت کو قدرتی مناظر سے کس قدر حیرت انگیز لگاؤ تھا۔

وہ سماں صبح کا اور جانوروں کا وہ غل
جب ہوا آئی جھٹکنے لگا زلفیں سنبل

پھول جو کھل رہے ہیں نغمہ سرا ہیں بلبل
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیمِ سحر اور اوس میں ڈوبے ہوئے گل

وہ ہوا دشت میں آئی کہ چمن پھول گئے
پیاس دو روز کی سب غنچہ دہن بھول گئے

اے خوشا وقت کہ عالم میں ہے ساماں بہار
پھر سنواری گئی ہے زلفِ پریشانِ بہار

سب مہیا ہیں وہ چیزیں جو ہیں شایانِ بہار
صحنِ گلشن میں ہیں گل دست و گریبانِ بہار

پھول سب کھلنے لگے شاخ ہر اک پھلنے لگی
گر کے حباب اوس تھمی سرد ہوا چلنے لگی

دائرے رکھتا ہے روانی پانی
باسحا عکس سے سبزے کے ہے دھانی پانی

کچھ جو کہتا ہے تو موجوں کی زبانی پانی
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے پانی پانی

آتش افروز کوئی چیز نہ تھی پانی میں
رنگ گل کا جو کٹا آگ لگی پانی میں

ایسی مستانہ روش بادِ بہاری آئی
اُلجھے پھولوں میں قدم سبزہ میں ٹھوکر کھائی
آنکھ نرگس کی کھلی باغ میں آہٹ پائی
شاخیں جھومیں کہ ہر اک نخل نے لی انگڑائی

بلبل اس درجہ ہوئی شاد کہ چلّانے لگی
سبزہ لہرانے لگا نہر میں موج آنے لگی

کتنی دلچسپ ہے سبزہ کے نکلنے کی بہار
کیوں صبا دوڑتی پھرتی ہے میانِ گلزار
ہے زمیں باغ کی گویا کسی نعمت کا عدا
سبزہ حوا بیدہ ہے کہدے کوئی نرگس شہلا!

بے خبر ہے یہ عیاں ہے نظر بلبل سے
آنکھیں سب سینکتی ہیں آتشِ رنگِ گل سے

کچھ عجب صورتیں غنچوں کی ہیں پھولی پھولی
جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
منع بلبل نے کیا چیز کسی نے جو لی
بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی

بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زباں کھل جائے

وہ ہوا باغ کی وہ ابر کا آنا جانا
قصہ بلبل کا کہیں گل کا کہیں افسانا
حسن اور عشق کا ہر ایک ہے دیوانا
کثرتِ گل یہ ہے مشکل ہے خزاں کا آنا

راستے بند ہیں پھولوں کا مرا تازہ ہے
دہنِ غنچہ ہے یا باغ کا دروازہ ہے

امام حسینؑ عالم یاس میں کھڑے ہیں کوئی مونس و یاور نہیں کہ قاصدِ صغرا نمودار ہوتا ہے آپ اُس سے اپنی دُور اُفتادہ بیٹی کا حال دریافت فرماتے ہیں قاصد امام حسینؑ کو دیکھ کے حیرت انگیز لہجہ میں اظہارِ تاسف کرتا ہے اور پھر حالِ صغرا کہتا ہے

یوم کربلائے مبارک وہ ہوا یوں گویا
ہیں نہ پہچان سکا آپ کو یا شاہِ ہُدا
تھوڑے دن گذرے مدینہ میں ابھی دیکھا تھا
ریشِ اقدس میں سفیدی ہے عیاں اے آقا

بہت اُترا ہوا ہے چہرۂ انور حضرت
سینکڑوں زخم ہیں اور خون میں ہیں تر حضرت

دل تڑپنے لگا فرمایا کوئی خط ہے لا
بادِ صبا اُس نے قریب آکے جو مکتوب دیا
بولے شبیر کہ مشکل سے پڑھا جائے گا
اشک آنکھوں میں ہیں اور ضعفِ بصارت ہے سوا

ہے یہ نامہ غم و حسرت کی نشانی بھائی
حال کچھ اُس کا بیاں کردے زبانی بھائی

سر مجھ کا کر کہا اُس نے کہ ہیں ہم بہت
اب نقاہت سے ہوا ہو گئی ہیں ہم بہت
ہوئیں گھر بھر سے جُدا ٹرہ گیا آزار بہت
سب کی مشتاق ہیں ہے حسرتِ دیدار بہت

منتظر آنے کی ہیں در پہ کھڑی رہتی ہیں
تب جو بڑھتی ہے تو بے ہوش پڑی رہتی ہیں

مکتوب صغرا لے کے حضرت خیمہ میں تشریف لائے سب بیبیوں کو حال سنایا اور پھر آمادۂ رزمگاہ ہوئے کہ جناب زینب نے روک لیا تاکہ وہ ایک وصیت جناب فاطمہ کی کریں

بس صدقہ گئی گھوڑے سے اُتر آؤ ذرا
مجھ کو یاد آگئی اک بات بہت خوب ہوا
اُترے گھبرا کے فرس پر سے شہنشاہِ ہدا
بیٹھ جاؤ جو کہا خاک پہ بیٹھے مولا

عرض کی ایک بلا کش کا کہا کرتی ہوں
بھائی ۔ اماں کی وصیت میں ادا کرتی ہوں

نزع کے وقت یہ فرمائی تھیں وہ خوش خو
بے خطا زہر میں بجھے کا ترے بھائی کا لہو

آنے جب رخصت آخر کو وہ میرا مہ رو
ذبح کا وقت ہے نزدیک سمجھ لینا تو

جب چلے مرنے وہ محبوس بلا اے زینب
چوم لینا مرے بچہ کا گلا اے زینب

صفت تیر حسین

آب ہے سیل فنا دم ہے اک آفت اس کا
جائے امید قضا ہے درد ولہ اس کا

کم سمندر سے نہیں موج طبیعت اس کا
کھنچا اک قہر ہے جھکا ہے اک آفت اس کا

خوف سے اس کے فلک خم ہوا خم ایسا ہے
ملک الموت کی ہمدم ہوئی دم ایسا ہے

چال وہ قہر کی ہے جس سے زمیں ہل جائے
مردے اٹھنے لگیں ہر گور کی منزل جائے

رعب ایسا ہے کہ طاقت نہیں بسمل ہل جائے
وہ چمک آنکھیں جھپک جائیں ہر اک دل ہل جائے

تیزی ایسی ہے کہ جو برق کو بھی مات کرے
غصہ ایسا کہ زباں کاٹ لے جو بات کرے

صاف کہتی ہے کیونکر ہم نہ ازہوں میں
ملائے جان عدو کو یہ وار ہوں میں

ایک قرآن ہے اور دوسرا اعجاز ہوں میں
وہ خدا کا ہے کلام اور خدا ساز ہوں میں

ذکر دیں اس میں ہے میں دین کی شیدائی ہوں
اسمیں احکام ہیں اور حکم سے میں آئی ہوں

ساقی سے خطاب

ساقیا پہلے جو دی تھی وہی شراب ابھی دے
حشر تک نشہ رہے جس کا شراب ایسی دے

ہو مئے عشق بہت دے مجھے ہاتھوں ہاتھ
ہاں تجھے اپنی محبت کی قسم جلدی دے

سہل پینا نہیں اس کا متردد دل ہے
نام لے کر ترا پی جاؤں گا کیا مشکل ہے

طلب امداد

بادہ نوشانِ محبت کو بڑا نام ملا
پائی جنت کہ سند خلعت انعام ملا

بعد اُن کے مجھے مدح کا یہ کام ملا
جب میں آیا تو فقط دُرد تہ جام ملا

تو جو بے ہوش بنا دے تو مجھے ہوش آجائے
تو جو دے بادۂ سرجوش مجھے جوش آجائے

تو ہی ساقی مرا ہے ساقیِ کوثر ترا نام
کام پینا ہے مرا اور پلانا ترا کام

خم کے خم آج پلا دے مجھے دے جام پیاپے
روح کو چین ہو دل کو مرے آئے آرام

تا قیامت رہے عالم میں ترا دور پلا
جس قدر لے سکے زیادہ ہو کہوں اور پلا

پارسا بنت عنب کو بھی کہیں دیکھتے ہیں
حکم تیرا جو نہیں پھر کے نہیں دیکھتے ہیں

سیر گلزار فلک گوشہ نشیں دیکھتے ہیں
پیتے ہیں جو مئے دنیا وہ زمیں دیکھتے ہیں

نشۂ بادۂ کوثر کو سوا کر ساقی
دے مئے خم غدیر اُس میں ملا کر ساقی

بزم میں دیکھ کے انداز کرم بیٹھ گئے
ذوق پینے کا جنھیں تھا وہ بہم بیٹھ گئے

شوق میں خوم کے ساقی کے قدم بیٹھ گئے
ایک گوشہ کی طرف کہہ کے یہ ہم بیٹھ گئے

جام چلنے کو ہے سب اہل نظر بیٹھے ہیں ٭ آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

ایک سلوا لڑنے کو آتا ہوا اور شکست کھا کر واپس ہو جاتا ہے

پیچھے شہ کے قریب آ گیا وہ یا کے کمک
لی کماں شاہ سے ترکش سے نکالا ناوک

نکے اک تیر کے بدلے تھا وہ مردک
متصل آ گئے شبیر جھپکتے ہی پلک

دور کا حربہ تھا نیزہ کی سناں بھی کاٹی
چلہ بھی تیر بھی۔ ظالم کی کماں بھی کاٹی

کہا للکار کے لے میان سے جلدی تلوار
ٹوٹی تلوار جو اس کی تو ہوئی اک جھٹکا

کھینچ کر تیغ دو دم کرنے لگا پیہم وار
دست باجیہ ہوا جاتے جو رہے ہوش اک بار

تھا تن و توش سے اس کا تو دم پھول گیا
دوسری تیغ تھی ہمراہ۔ مگر بھول گیا

میرا کلام کیوں نہ صداقت مآل ہو
بند ۱۰۶ (در حال ماتم)

معاصر شاعر میدان نظم کی روانی اور دلچسپ تشبیہات

فضلِ خدا سے معرکے مارے بڑے بڑے
مضموں دلوں پہ نقش کیے جیسے نگ جڑے
میری طرح کسی کی طبیعت بھلا لڑے
مقتول جانا جو کوئی حرف گر پڑے

میدانِ نظم میں دمِ جنگ و جدال ہے
مضمون محوِ قتل نہ یہ خیال ہے

بڑھتا ہوں پڑھ کے نادِ علی بہرِ کارزار
مضموں کے دل سے نیزۂ فکر رسا ہے پار
صورت دوات سے ہوئی ترکش کی آشکار
پیکاں سے قطرہ ہائے سیاہی ہیں آبدار

ہر مد بنا ہے صورتِ میت کہ دم نہیں
حرفِ دائرہ ہے خون کی تھالی سے کم نہیں

آفت کا رن پڑا ہے جدھر کیجیے نظر
نقطے نہیں کٹے ہوئے سر ہیں ادھر ادھر
زیر و زبر پڑے کبھی یوں تھے نہ پیشتر
مصرعے دو لخت ہو گئے۔ اک لطف ہے مگر

سارے حروف صف کی طرح ہیں ملے ہوئے
بین السطور زخم ہیں گویا کھلے ہوئے

عیطا اور ماتم

اس وقت غیظ میں ہے جگر بند کو تراب
چہرے سے بار بار سرکتی ہے نقاب
برسا سے کبھی کبھی بدلی میں آفتاب
کچھ پار دکھائی دینے لگے ابر سے حباب

رن میں کھڑے ہیں حیدرِ صفدر کی شان سے
غل ہے کہ ذوالفقار نکلتی ہے میان سے

غصہ میں ہیں حضور جو اُلٹے ہوئے نقاب
طورِ غضب دکھاتا ہے زلفوں کا پیچ و تاب

وقتِ زوال ہے تو جہاں کو ہے اضطراب
گھبرا کے چڑھ گیا ہے بلندی پہ آفتاب

حالت ہوئی ہے غیر ہر اک روسیاہ کی
سب کو جلائے دیتی ہے گرمی نگاہ کی

پیاسے لگی دو وقت وتاب سے رہی
دریا سراب ہو گئے باقی نہیں نمی
پانی کی ہو گئی ہے سمندر میں کمی
اُف رے مزاجِ سرورِ والا کی برہمی

مارِ غضب کا سب کو یہ عالم دکھا دیا
صحرا کے ہر کڑھے کو جہنم بنا دیا

ہے طرہ شاہِ جان حالت سپاہ کی
ہو گئی یہ شکوہ کسی بادشاہ کی
حالت ہے غیر ہو گئے عدو سیاہ کی
ہے رتبہ قیصر کا زیرِ نگاہ کی

شہ کی تشنگی ہے فرس پر عتاب ہیں
گردوں پہ ایک بادل ہے اک ہے کباب ہیں

امام حسین زخمی ہو چکے ہیں کوئی انصار و اعزا سے باقی نہیں کہ زعفر بن نمودار ہوتا ہے اور اجازت نصرت چاہتا ہے۔

اُس نے کہا کہ اے امدِ کبریا کے لال
صدقہ میں آپ کے ہے یہ جاہ و جلال
مجھ سے ہو کوئی سر پہ کیا کیا مجال
ہیں لوگ ساتھ لاکھوں کو بائیں لاکھوں

مر جاؤں لڑکے دھیان یہ ہر بار ہے مجھے
حضرت کا حال دیکھنا دشوار ہے مجھے

حالت ماتم کا ہمسا ال آنکر ہوا یا دلبسکر فرمائے آئی

قربان اُس کے لطف و کرم کے میں نانواں
اُس کی عطا ہوئی تو دیا میں نے امتحاں
کچھ تجھ سے اپنی پیاس کا عالم کروں بیاں
دل جل گیا ہر ایک نفس ہے شرر فشاں

گو سلسبیل کوثر و تسنیم پاس ہے
خالق بجھائے گر تو مجھے ایسی پیاس ہے

ابھی تو پیاس کا مجھے اتنا نہیں خیال
آئے تھے پانی لینے کو عباس خوشخصال
پیاسے جہاں سے جو گئے اُن کا ہے یہ ملال
مانع ہوئے یہ غصب کیا۔ طاہر تھا ان کا حال

رایت کی چوب خشک نہ تھی مدّ آہ تھی
سوکھی وہ مشک تشنہ لبی کی گواہ تھی

باتیں یہ کر رہے تھے شہنشاہ نامدار
باجے بجا بجا کے بڑھی فوج نابکار
فرمایا۔ میرے حکم سے جا۔ اے وفا شعار
وہ وقت آ گیا مجھے تھا جس کا انتظار

ساماں کیا شروع شہ ذی وقار نے
دونو قدم رکابوں میں رکھے حضور نے

آتش نفس بھی ہے یہ فرس باد پا بھی ہے
قدرت خدا کی آگ بھی ہے اور ہوا بھی ہے
صرصر بھی ہے نسیم بھی ہے اور صبا بھی ہے
سرعت کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

خلقت ہے اس کی کیا متحیر جہان ہے
اضداد جمع ہو گئے خالق کی شان ہے

ماسد فکر شاعر خوش فکر دور دو
نازک خرام کوہ وقار اور تیز رو
اُس کو سبک روی کے طریقے ہیں یاد سو
یوں رکھے پاؤں شمع کی پلنے نہ پائے لو

مثل نگہ پھرے یہ کسی پر اثر نہ ہو
محمل میں آ کے جائے کسی کو خبر نہ ہو

ہیں کچھ عجیب تیغ کے حالات وقت جنگ
ممکن ہوئے ہیں سارے محالات وقت جنگ

آتے ہیں اس کو طرفہ خیالات وقتِ جنگ
ہی اک زبان لاکھ سوالات وقتِ جنگ

فقرہ ہر ایک تیز دمِ کارزار ہی
جوہر یکارتے ہیں کہ یہ ذوالفقار ہی

زندہ اسی کے دم سے ہوئی روح کا پیکر
نام اس کا سن کے اٹھتے ہیں اہلِ ستم کا سر
اُڑتی ہی اس کے خوف سے روئے زمیں پہ خاک
کہتی ہی بار بار قضا روحا هلاك

کیوں ڈر سے آفتاب کا چہرہ نہ زرد ہو
دیکھے جو اس کی آنچ جہنم بھی سرد ہو

ہر ایک فوجِ ظلم و ستم کا نشاں گرا
اللہ رے رو و تیغ ہر اک پہلواں گرا
کوئی سنبھل کے یاں سے جو اٹھا وہاں گرا
قُل تھا زمیں پہ بیٹھ گئی آسماں گرا

چلتی ہی یوں کہ فوجِ ستم پائمال ہی
قائل ہیں اس کے سب کہ قیامت کی چال ہی

کب ظالموں میں شورِ اماں و سدم نہیں
تھم جائیں ان میں ایک کے ایسے قدم نہیں
ہستی وہ کس کی ہی کہ قریبِ عدم نہیں
دم اس کا بھر رہا ہی لعینوں میں دم نہیں

دریائے موجِ شام کی کیا کائنات ہی
اس بحر کا تو گھاٹ قریبِ فرات ہی

جس سے ملی یہ اُس کے گلے سے قضا ملی
کٹ کٹ گئی جو راہ میں موجِ ہوا ملی
بسمل تھے اس قدر نہ تڑپنے کی جا ملی
جب اُٹھی کر کے چرخ چہارم سے جا ملی

دہشت سے آفتاب کا بھی زرد رنگ ہی
جیسے کو ہی خبر کہ قیامت کی جنگ ہی

ہے موجِ جنگ مالکِ تسنیم و سلسبیل
بہرِ سپاہِ تیغ کا پانی ہوا سبیل

عقدہ میں وار کرتے ہیں جب سرورِ جلیل
اپنے پروں کو دیکھنے لگتے ہیں جبرئیل

گہ ڈر سے دُور گاہ محبت سے پاس ہیں
خیبر کا حال یاد جو ہے بے حواس ہیں

کھنچنا بھی اس کا قہر ہے جھکنا بھی ہے ستم
جلّاتی ہے اجل کہ ضیمت ہے اس کا دم

جس دن سے آئی چرخ سے تیغِ شہِ امم
یکساں ہے آج تک کبھی تیزی ہوئی نہ کم

یہ وصف دار مثلِ شہِ خوش صفات ہے
کہنے کو دو زبانیں ہیں پر ایک بات ہے

سیریں کہیں۔ جدا سرِ اہلِ ستم ہوئے
تیرہ سے یہ علیحدہ تیغوں سے دم ہوئے

سب فوجِ بے نشاں ہوئی ٹکڑے علم ہوئے
پوریں جدا جدا ہوئیں نیزے قلم ہوئے

بے آبِ تیغیں تھیں یہ بدصفات ہیں
پانی نہ اتنا تھا کوئی ڈالے دوات ہیں

خوفِ اس کا مثلِ تیغِ دو دم کم کر گیا
سمجھا حیات مل گئی جو شخص مر گیا

جب یہ تھمی تو حل ہوا دریا ٹھہر گیا
جب یہ چلی تو زیست کا موسم گزر گیا

یہ گرم رو نظر کی طرح سے جو مڑ گئی
سمٹی یہ دھوپ ایک شرر بن کے اڑ گئی

رن پر چڑھا ہے اسپِ شہِ دین دم جہاد
چوبیں ہی ہیں خیمۂ گردوں کی گرد باد

ہے طرفہ چیز تیغِ شہنشاہِ خوش نہاد
ہے میخ پر ہلال زمیں پر قضا نژاد

کس طرح معجزہ یہ نہیں ساحری نہیں ٭ دریا یہ وہ ہے آب میں جس کے تری نہیں

سب فوج منتشر ہی عجب انتشار ہی
ہی تیغ یا ستارۂ دُنبالہ دار ہی
جوہر ہر ایک دیدۂ مردم شکار ہی
قبضہ بھی اس کا تاج سرِ اضطرار ہی

سب کے سروں پہ جلتی ہی پایہ بلند ہی
ہی ہاتھ میں حسین کے رتبہ بلند ہی

حملہ امام سے پہلے لشکر کا حال شاہ سب کی اماں طلبی ایک پہلوان کی آمد او موت

ٹھیرے امامِ دیں جو سُنا شورِ الاماں
کاندھے پہ رکھی توبرہ کے تیغ شرر فشاں
اک سمت کانپتا ہے اونچا ہوا نشاں
لشکر سے ڈرتے ڈرتے بڑھا ایک پہلواں

لشکر پہ یار کا لوں پہ جس دم لعین نے
مشکل سے اُس کا بوجھ سنبھالا زمین نے

ساقی نامہ

ساقی کہہ دے کوئی کہ اب دیر کیا ہی آئے
ہی ہی یہ مے نہیں اسے جم غلام لائے
حسرت میں جان جاتی ہی جلدی مجھے پلائے
ہوں درد مدد کے تڑپنے سے ہائے ہائے

ساغر کہاں کا شوق کی تلوار کھائے ہوں
لے ہاتھ میں سبو کہ میں جلو لگائے ہوں

اللہ کا کرم ہی تری ذات ساقیا
برمِ جہاں ہی بزمِ خرابات ساقیا
لیتا ہوں تیرا نام میں دن رات ساقیا
کیا کہنا تیرا اور تری کیا بات ساقیا

واللہ تیرے قبضہ میں دونو جہان ہیں
تو مہرباں اگر ہی تو کل مہربان ہیں

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے

بند ۱۰۰ (درحال جناب امام حسینؑ)

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے
چرخ پر صبح کے آثار نظر آنے لگے

شب عاشور چلی غم کی خبر پانے لگے
ہر طرف مرغِ سحر دشت میں چلانے لگے

دل جو بھر آیا تو اک آہ بھری حضرت نے
کی ادا اٹھ کے نمازِ سحری حضرت نے

آمد صبح

شان وہ صبح کے آنے کی وہ لطفِ صحرا
گندمی رنگ کے معشوق کا چہرہ نکلا

چتر زرِ خسروِ خاور کا افق سے چمکا
کسی محبوب کی ہے زرد قبا کا پردا

زعفراں کا ہے یہ کھیت اس کا ہے گل حلقت میں
گل صد برگ کھلا ہے چمن جنت میں

طلوع مہر

سُرخی مہر سے روشن ہے کہ ہے شعلۂ طور
سیل کی طرح لگا پھیلنے ہر سمت کو نور

نئی صورت سے ہے اب نوح کے طوفاں کا ظہور
ہر طرف نور ہوا خلق میں مار التنور

ہے یہ طوفان نیا اس میں نئی خوبی ہے
سب نظر آتے ہیں یوں خلق خدا ڈوبی ہے

حرب کا حملہ سے برآمد ہونا

برہم انصار میں جب وہ شہِ ذیشاں آیا
دست بوسی کو ہر ایک صاحب ایماں آیا

ساتھ احمد کے ہر اک خاصۂ یزداں آیا
حوریں حاضر ہوئیں پابوسی کو رضواں آیا

جوش پر رحمت رب دوسرا بھی آئی
سب کے سب آئے تو جنت کی ہوا بھی آئی

بہار

پھر بہار آنے میں کیا دیر تھی کہنے لگے گل
وجد میں لائی درختوں کو صدائے بلبل

خود بخود جوش میں بل کھا گئی الفِ سنبل
مست کرنے لگا کہسار میں طاؤس کا غل

میاں قطرۂ شبنم سے نمو پائے ہوئے
کس کی الفت میں ہیں ہیرے کی کنی کھائے ہوئے

پوری امیدیں ہوں وقت بہار آجائے
پوری پوری نظر آنکھوں کو بہار آجائے
دل عاشق کو تمنا ہے کہ یار آجائے
پیش خیمہ ابھی آیا ہے بہار آجائے

غنچے سب چٹکیں تو باتیں ابھی ساری بن جائیں
سر میں قافلۂ فصلِ بہاری بن جائیں

کہ تیا گل

ایسی ہے کثرت گل جس کا ٹھکانا ہی نہیں
زلزلہ آئے تو اب ہل نہیں سکتے کی زمیں
ڈھیر دم بھر میں پہنچنے کو ہیں تا چرخِ بریں
ہر طرف لوٹ ہے یوں خیمے ہیں پھول جیسے

چار مہینے میں ہے بلبل یہی چلاتی رہی
آخر اس بھیڑ میں کس کی نظر جاتی رہی

ساقی نامہ

ساقیا جلد بھر لے ترا میخوار ہوں میں
ہوشیاری ہے بڑا عاشقِ سرشار ہوں میں
عیش سے ماگ کے ساقی ترا میخوار ہوں میں
جام دے دے مجھے جب تجھ سے طلبگار ہوں میں

کر کے بے ہوش مجھے ہوش میں لانے والا
کون ہے تیرے سوا میرا پلانے والا

خیر پوری نہ کرے میری تمنا نہ سہی
مے الفت مجھے جی بھر کے نہ دیگا نہ سہی
نہر بادہ نہ سہی قلزم و دریا نہ سہی
نہ سہی جام و سبو و خم و مینا نہ سہی

ساقیا بوذر و مقدار کا رتبہ تو ہو
جس قدر نشہ تھا سامان کو اتنا تو ہو

ہاں مگر اجر رسالت کا یہی ہے مادا
کہ عنایت سے مودت سے خالق نے کہا
اوّل اُن اہلِ قرابت میں تمھی کو یا یا
جو طلبگار ہو کرتا ہے خود اللہ عطا

مذہب بندہ نصیری سے جدا ہے ساقی
تو نہ دے خیر ہمارا ابھی خدا ہے ساقی

لشکر اللہ کی آمد کی خبر سن کر امام حسین کا خیمہ سے باہر آنا

دھوپ نکلی کہ ہوئے حشر کے آثار عیاں
بیٹھے تھے خیمۂ انصار میں سلطان زماں
خبر آئی کہ ہے یارا دھر فوجِ گراں
قتل سادات کا سب ہو گیا رن میں ساماں

باجے بجتے ہیں رہیں دشت کی تھراتی ہے
ٹرہ کے ٹنکے کی صدا کوہ سے ٹکراتی ہے

دو سرگنتے ہی سب خادم سرکار اُٹھے
جانیں آقا پہ فدا کرنے کو انصار اُٹھے
بگڑے عباس علی نیکے تلوار اُٹھے
دیکھ کے تیور کا غصہ شہِ ابرار اُٹھے

آپ اُس وقت بھی اعدا پہ ترس کھانے لگے
ہاتھ شانے پہ دھرا بھائی کو سمجھانے لگے

وصف فرس امام

اُس کو خالق نے دیا مرتبہ ایسا اس میں کلام
ہے پیمبر کا فرس اور سوار اس پہ امام
گر یہ تشبیہ ہو عفو کرے ربِ انام
وہ یہ قرآن کی سطریں ہیں کہ ہر اس کی کلام

حوریں ہر مرتبہ لیتی ہیں بلائیں اس کی
حلقۂ چشم ملک دونور کا ہیں اس کی

جان اس گھوڑے میں ہے تیغِ علی میں کی
قدم اس کے کبھی جو ہوں یہ ہوا کو سی ہوں
ڈر جو ہے آیا تو پامال کرے گا یہ فرس
ہر طرف سے یہ صدا دیتے ہیں اعدا بس بس

رحم آتا ہے جو سب خوف سے چلاتے ہیں * آپ باگوں کو بہت کستے ہوئے آتے ہیں

تلوار کی تعریف

فوجیں ہٹنے لگیں شعلے لگے سلطان دل
ریحماں انھیں کہنے لگی ہر ایک کی
تہ بہ تک ہاتھ کا آنا تو ہوا سب ساں
یوں ہلی تیغ کہ رستہ خسرو کی زباں

جلد تر لیے کو ایوں سے جھپٹ کے نکلی
میان سے نکلی جھمک بعد یہ پہلے نکلی

مو۔ کہتی ہے تو ہے سامنے میں ل کہتی ہے
گو کہ ہے فرق یہ کہاں مو سے تیرے تن میں
اور تو نے نہیں لیا اور نہیں جاتے ہیں
سچ ہے مادر کو مادر سے گی ہیں کہ دل میں

جب کہ دنیا ہوئی ہے خلق میں جب آئی ہے
کچھ نہ آیا تو سمجھتی ہوں کہ اسا آئی ہوں

کھل گیا صاف کہ ہے میر اجل اور یہ جواں
اس کا کھنچنا ہے کہ ہے جنگ حدل کا اعلان
سچ یہ ہے قابل تحریر ہے جو اس کی شان
جوہر اس میں ہے کہ لکھا ہوا ہے یک قرآن

شاہ کہتے ہیں قسم بخشش امت کے لیے
کہ اٹھایا ہے اسے آج شہادت کے لیے

شہادت امام حسین کی روداد۔ اہل فوج اور آمیر خطاب۔

رن میں جب وقت سے قتل تنہا دل کی
ننگے سر خیمہ سے زینب نکل آئیں اک
سینہ اکبر کی گردن پہ جو دیکھی تلوار
بیٹے سر سے کہنے لگیں اور ماہنجار

تہ جگر دل محبوب عدا ہے ظالم
وائے ہو تجھ پہ کہ تو دیکھ رہا ہے ظالم

کبھی قبروں کی طرف دیکھ کے دیتی تھیں صدا
ہو عرب اور عجم سب سے اہل قرا
تم میں مہمان ہے دلبند رسول دوسرا
کس سے فریاد کریں کوئی بھی باقی نہ رہا

اب طلبگار ہوں امداد کی کس سے جا کر
دیکھو ہم لٹ گئے بستی میں تمہاری آ کر

حالِ رینسا کا جو کچھ تھا نہ دکھائے داور
ساتھ کھنچی ہوئی جاتی تھی زمیں پر جا دور

دوڑ کے جاتی تھی اس سمت کبھی گاہ اُدھر
خاک پر بیٹھ کے آخر یہ پکاریں مضطر

مورِ رنج و غم و درد و پریشانی ہوں
امتی لوگو حرلوکہ میں سیدانی ہوں

محضرِ خونِ شہیداں ہے مرا دامنِ دل

بحر ۹۶ (در حالِ امامؑ)

صبح عاشور کا معکوس اثر

صبح عاشور کی جب دشت میں تنویر ہوئی
لیلیٰ شب کی جوانی نہ رہی پیر ہوئی

رن میں جو تھی وہ اک نور کی تصویر ہوئی
دل جلے سرد ہوا میں ہی نہ تاثیر ہوئی

یوں ہلے مرگِ سحر شورِ فغاں اُٹھنے لگا
شبنم اُڑنے لگی آہوں کا دھواں اُٹھنے لگا

نمازِ سحر اور مرتضیٰ العباس عباد و گداز

ہوئے مشغول نمازِ سحری میں سرور
پیچھے صف باندھے ہوئے سارے عزیز و یاور

سب کے سب بانیِ مقداد و تمیم و بوذر
رتبہ میں فرش سے کعبہ کے مصلّے بہتر

متوجہ سوئے حق قلب و جگر تھے اُن کے
پاؤں تھے فرش پہ اور عرش پہ سر تھے اُن کے

طلوعِ خورشید

تاجِ زریں سے ہوا جب سرِ گردوں پُرنور
خضر نے چاہا کہ قدم اختر سے عبور

رنگ وہ چرخ کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور
شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سر میں وہ نور

کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سُرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

سلام امامؑ کے مدنی مناظر

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی
کہ بطرباغ کی صحرا میں فضا آنے لگی

غنچہ گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی

سبھی ہر مذہب آقا کی طرف مُڑنے لگے
رانیں ہلنے لگیں دامانِ قبا اُڑنے لگے

بھوکوں دھلِ بہا آتے ہی نکبت پائی
در گل مل گیا گلچیں کے یہ دولت پائی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس قدر کثرت گل ہے کہ ہمیں جس کا حساب
مٹی منہدی کی ہر اک دکھ کو کرتی ہے خراب

رات آتی ہوں چاں کیسا ہے خدا
دمبدم فصل بہاری سے ہے جواب

شوق سننے کا ہے ہر دم اسی تدبیر میں ساتھ
روز اول ہی سے سننا تری تقدیر میں ساتھ

آتش گل [illegible] کو بھی نہ
[illegible] کہیں گر آتش تر

[illegible] اعتدال [illegible] کی [illegible]
گل [illegible] شعلہ سے بڑھ کر [illegible]

[illegible] کہوں [illegible] گل
کہ [illegible] دل کے خاصر [illegible] گل

قطرے شبنم کے ہر اک سمت ہزاروں ہیں [illegible]
ہیں شجر سارے مثمر بھی ہوتا ہے کمال

جوہری [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] کا بھلا کون اٹھاتا احسان

کیسے ہیں فصل بہاری [illegible] یہ جوہر پیدا
کہ درختوں میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

[illegible] ہے [illegible]
دمبدم آتی ہے گلزار کی اک [illegible]

کبھی اس گل [illegible] کبھی اس گل
کبھی جاتی ہے ادھر کبھی آتی ہے ادھر

[illegible] میں لوٹتے ہیں [illegible] خراں دیدہ بھی
[illegible] ہے [illegible] سبزہ خوابیدہ بھی

[illegible] عزیزوں [illegible]
[illegible] غلاموں سے بھی آقا کے [illegible]

ایک مدت سے [illegible] تھے ہم چھوٹ گئے
روکے فرماتے تھے احباب سے ہم چھوٹ گئے

[illegible] جاں حزیں [illegible] آہیں [illegible] کبھی اور کبھی روتے تھے

[illegible] عالم بہار [illegible] مرد [illegible] کو [illegible] اور [illegible] کو [illegible]

کبھی دل تھام کے چلاتے تھے اکبر اکبر
غم جو عباس کا تھا تھامے تھے ہاتھوں سے جگر
مضطرب ہوتے تھے جب جاتی تھی لاشوں پہ نظر
دل کو اس ہاتھ سے اُس ہاتھ سے تھامے تھے جگر

جوشِ غم تھا کبھی اُٹھتے تھے کبھی گرتے تھے
دل نہ تھمتا تھا تو بیتاب پڑے پھرتے تھے

کبھی لاشوں کی طرف دیکھ کے کرتے تھے کلام
اے زہیر اب غم و اندوہ سے ہے کام تمام
اے حبیب آؤ گلا کٹنے کا آیا ہے مقام
سب کے سب میری خبر لو میں تمہارا ہوں امام

مطمئن ہو دلِ خستہ جگر آواز تو دو
نہ اُٹھو میری مدد کو مگر آواز تو دو

امام حسین اور رزمیہ صورت اسد اللہ امام

حال اس طرح کی ہے پیروں کے دل ملتی ہے
یہ ملا وہ ہے کہ ٹالے سے نہیں ٹلتی ہے
کستا ہے سینہ ہے ہیکل جو ذرا ہلتی ہے
تیر کچھ بھی نہیں کہنے کو ہوا چلتی ہے

ناز و اعجاز دکھانے پہ اگر آئے ابھی
چشم موزن سے نگہ جی کے نکل جائے ابھی

آ کے میدان میں ٹھیرے جو شہِ شاہِ زمن
آئی آواز نگیر اور ہوا شور بدن
چوٹ ڈنکے پہ لگی گونج گیا سارا رن
دشت سے چوکڑیاں بھر کے ہوئے شیر ہرن

واں جو ہر ظالم و گمراہ کے تیور بدلے
یاں بھی شیر اسد اللہ کے تیور بدلے

ع حسنی کی تعریف

ہے خدا داد یہ تیغ اس کا بھلا کہنا کیا
فیل ہے قبضہ میں کہ نکلا ہے یہیں سے دریا
آب کی طرح سے مستعد ہے اس کا بڑھنا
جو قریب اس سے ہے اُس سے بھی یہ تیغ ہے جدا

تیز چلنے کی صفائی کی کبھی خو نہ گئی * اس طرح نکلی کہ کاٹی بھی کبھی چھو نہ گئی

کس کا منہ ہے جو ترے یا سوئے شمشیر چلے
جس کو چلنا ہو سوئے نار وہ بے تیر چلے
یوں تو تلواریں چلیں تیر سے چلے تیر چلے
تھیں صفیں صاف جدھر حضرت شبیر چلے

ایک کو بھی ہنر جنگ دکھانے نہ دیا
ہاتھ اٹھا تو کہاں سر بھی اٹھانے نہ دیا

کشتی تیغ چلے فوج کا دریا کٹ جائے
کیا عجب آج اگر قعر جہنم پٹ جائے
کہ وہ میداں سے ہر ایک فرشتہ ہٹ جائے
مثل جبریل کوئی پر نہ کسی کا کٹ جائے

اور سر ویک اگر فوج شرر آ جائے گی
سب کو خیبر کی لڑائی نظر آ جائے گی

تیغ جب بڑھتی ہے یہ فوج سرک جاتی ہے
یہ وہ شعلہ ہے کہ تا چرخ لپک جاتی ہے
وہ ادا ہے کہ ہر اک لاج سمٹ جاتی ہے
رن سے اس برق کی کوندے میں چمک جاتی ہے

ہوش کم کر دیتے ہیں یوں دم بیکار چلی
لوگ کہتے ہوئے جاتے ہیں کہ تلوار چلی

اسی ساقی سے رہی تسنیم کرم عالم کو
اپنا میکش کیا موسیٰ کو بن مریم کو
مادۂ عشق تو ہے سرشار ازل آدم کو
بخشوانے کے لیے دی مئے الفت ہم کو

سامعین مرثیہ پڑھنے والے کو مسکرتے ہوئے حالات

تشنہ اس روز کا ہم سب کو ابھی باقی ہے
محفل اہل اسلام کا وہ ساقی ہے

کس طرح ہوتی ہے یا عمر بسر دیکھ تو لے
ہو چکا حال ہر شوخ و گر دیکھ تو لے
تشنہ دیدار کو اب ایک نظر دیکھ تو لے
بھر چکا جام ادھر پھر کے ادھر دیکھ تو لے

وقت آخر ہے خوش اے جام سے ناکام ملے
ہاں ہونٹوں پہ ادھر آئے ادھر جام ملے

ساقیا بادۂ الفت سے تو بھر دے ساغر
کسی عالم میں بھٹکتے نہیں تیرے میخوار

مے کشی گر دیگنہ ہو تو کریں ہم سودا
کہے دیتے ہیں کہ سمجھائے نہ کوئی ہمارا

جوش میں جام سے شیشے ابھی رہ جائیں گے
نام توبہ کا سنیں گے تو بکھر جائیں گے

اصل کیا خم کی بھلا ساغر و مینا کیا ہے
کر سکتا ہوں ساقی اس کا دکھا کیا ہے

جز کیا پیر مغاں ساقی و ماکیا ہے
کہہ دیں کسی اور سے مانگوں مجھے یہ کیا ہے

دل میں آئے گا تو بھر دے گا کبھی ہی میرا
میں ہوں اور ملامت ہے ساقی میرا

گلکدہ

شاعر شیریں مقال ادیب بے مثال سحر بیان رمان غالب و راں لسان لہجہ جناب مرزا محمد ہادی صاحب مدظلہ کے نام نامی دنیائے ادب سے بخوبی واقف ہے۔ ممدوح کی غزلوں کا مجموعہ بنام گلکدہ دوبارہ چھپکر شائع ہو چکا ہے۔ جو لوگ مشتاق گلکدہ تھے اور بسبب مالی سفر مستفید نہیں ہو سکے اُن کو اطلاع دی جاتی ہے کہ خریدنے میں تامل نہ کریں دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت (عہ/)

المشتہر

ابو محمد عزیز منزل اشرف آباد لکھنؤ

عباس نے جب ان کی رضا شاہ سے چاہی

بند ۱۰۴ (درحال جناب عباس)

طلب اجازت جناب عباس از امام حسین و امام حسین فرماتے ہیں اور کہتے ہیں

افسوس ہے اتنے بس تک جنھیں پالا
وہ مرنے کو جاتے ہیں یہ انداز نکالا

دو روز بھی گھر بعد ہمارے نہ سنبھالا
کس طرح کی فصل آئی ہے اللہ تعالیٰ

جو قوت بازو تھے وہی چھوڑ چلے ہیں
تھا جن سے قوی دل وہی دل توڑ چلے ہیں

ہم نے کسی عالم میں کسی کو نہیں چھوڑا
راحت ہوئی یا رنج کبھی منہ کو نہ موڑا

جس امر کی ضد کی وہ کیا دل نہیں توڑا
پر اب غم و اندوہ سے دل ہو گیا تھوڑا

ہم کچھ بھی بحال حق کی کہہ نہیں سکتے
لیکن یہ جدائی کا قلق سہہ نہیں سکتے

مراد حال جناب اور طلب رخصت کا مناسب تیر لیا

اے بحر کرم میرا کرم اے شہ جمہور
حاذم قدم پاک سے ہوتا نہ کبھی دور

ہیں امر وہ درپیش کہ اس وقت ہوں مجبور
خوشنودی حق دین کی تائید ہے منظور

اس بات سے خوش ہوتے ہیں ماں باپ بھی آقا
فرمائیں نہ اس باب میں عذر آپ بھی آقا

امام حسین کا حضرت علی اکبر کو پہلے اجازت دینے کا ارادہ فرمانا جناب عباس کا اصرار اجازت پر

ارشاد کیا شاہ نے اے حق کے فدائی
میں بھی تو کسی وجہ سے مجبور ہوں بھائی

ہو کون مددگار جو ہو تم سے جدائی
مجھ کو بھی تو منظور ہے اے عدہ وفائی

دانڈیں نہ لٹیں روکنے والا تو کوئی ہو
پردے میں بٹھائے انھیں اتنا تو کوئی ہو

حامل علم فوج کے ہو تم مرے غمخوار
اکبر سے کہو جائیں سوئے لشکر کفار

کی عرض یہ سردار ہیں یا سیدِ ابرار
لازم ہے کہ سردار کے آگے ہو علمدار

پہلے مرے مرنے کا ہو کل فوجِ لعیں میں
مختار ہیں پھر جائیں یہ فردوسِ بریں میں

ان کو طرفِ فوجِ ستم جانے نہ دونگا
پہلے کبھی یا شاہِ امم جانے نہ دونگا
خود جاؤں گا پر سوئے عدم جانے نہ دونگا
میں آپ کے قدموں کی قسم جانے نہ دونگا

مالک یہ نہ صدقہ ہو ملازم سے نہ ہوگا
یہ خوش ہوں کہ ناراض یہ خادم سے نہ ہوگا

ان باتوں پر آیا جو تہہ دیں کو بہت پیار
لپٹا کے گلے رونے لگے سیدِ ابرار
قدموں کی طرف جھک گئے عباسِ علمدار
تسہ نے کہا ہاں ہاں مرے مونس مرے غمخوار

طاقت ہے نہ اب صبر کا مقدور ہے مجھ کو
پر جس میں ہو تم خوش وہی منظور ہے مجھ کو

کپڑے جو پہننے لگا وہ شاہ کا شیدا
زوجہ نے کہا روکے کہاں کا ہے ارادہ
بولے کہ ہے حرب کی طرف قصد سفر کا
ممکن نہیں میداں سے پھر کر مرا آنا

فوجیں نہ بڑھ آئیں کہیں اندھیر نہ ہو جائے
کہنا ہو جو کچھ جلد کہو دیر نہ ہو جائے

بولیں کہ خدا کے لیے مرنے کو نہ جاؤ
صاحب ہمیں پردیس میں بیوہ نہ بناؤ
روتے ہیں اسیر دو کو نزدیک بلاؤ
شفقت سے انہیں پیار کرو پاس بٹھاؤ

گھر سے نہ نکل جائیں کہیں بعد تمہارے
مجھ سے یہ سنبھلنے کے نہیں بعد تمہارے

چلائیں رنڈاپے کی بلا آتی ہے سر پہ
اس وقت تو قابو ہے نہ دل پر نہ جگر پہ
کس قہر کی آتی ہے تباہی مرے گھر پہ
روتی ہوں۔ کہ بس ہے مقدر کی دیدۂ تر پہ

لونڈی ہوں کسی طرح کی عزت نہیں رکھتی
روکوں تمہیں اتنی بھی لیاقت نہیں رکھتی

آقا سے کہوں آپ انہیں روکیے یا شاہ
فرمایا کہ ایسا نہ کہیں کیجیو للہ
میں اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا واللہ
باعث یہی عزت کا ہے کیا تم نہیں آگاہ

دامن کہیں تم بہرِ خدا تھام نہ لینا
جاتا ہوں میں اب روکنے کا نام نہ لینا

سکینہ کا بھی سر لے لو اور جانے سکینہ کی گھٹی

جب صحن میں آیا وہ یداللہ کا جانی
شاہِ شہدا کرنے لگے اشک فشانی
کی بیبیوں نے بانو کے صف ماتم خوانی
دی مشک سکینہ نے کہ لاؤ ہمیں پانی

تھا باتوں یہ نادان کی حل آہ و بکا کا
ضد کر رہی تھیں ہاتھ میں دامن تھا چچا کا

یہ کہتے تھے دم بھر کی مصیبت ہے جھیلو
وہ کہتی تھی بھر جائیو پانی مجھے دے لو
یہ کہتے تھے قربان چچا بچوں میں کھیلو
وہ کہتی تھی مانونگی نہیں گود میں لے لو

گودی میں نہیں تھامے ہوئے ہاتھ چلونگی
پیاسی ہوں بہت نہر پہ میں ساتھ چلونگی

عزم میداں سا سا عباس

چومے قدمِ شاہ چڑھا گھوڑے پہ غازی
باگ اٹھتے ہی طاؤسِ جہاں بن گیا بازی
سرعت نے دکھائی یہ نئی شعبدہ بازی
خود ہو گئی کوتہ رہِ میداں کی درازی

اعدا سے نگہ صاحبِ شمشیر نے بدلی ✻ جب سامنے میدان آئے نگہ شیر نے بدلی

شوکت وہ علمدار کی وہ شان علم کی
تلوار کی بجلی کبھی ٹھیری کبھی چمکی

آواز بھی آتی نہیں گھوڑے کے قدم کی
پامال ہوئی جاتی ہے سب فوج ستم کی

ہے سرخ زمیں خون جو اعدا کا بہا ہے
وہ شیر کے نعرے ہیں کہ رن گونج رہا ہے

جس نے انھیں ٹوکا اُسے زندہ نہیں چھوڑا
فوجیں ہیں بہت گرد مگر دل نہیں تھوڑا

اُس ہاتھ میں ہے باگ نہ اس ہاتھ میں کوڑا
جس سمت نظر پھرتی ہے پھر پڑتا ہے گھوڑا

کیوں کر نہ اشارے میں ہو وہ خوش سیر ان کے
گویا کہ لگام اُس کی ہے تار نظر ان کے

توصیف فرس
جوش عنان

اُڑتا ہے فرس بن گئے ہیں امن زمیں پر
رُکتا ہے کسی سے نہ ٹھہرتا ہے کہیں پر

ہے لعل کا پرتو مہ نو چرخ بریں پر
کھلتے ہیں گل نقش قدم رن کی زمیں پر

ہے بلبل شیدا بھی مقرر جلوہ گری کی
کیا چال اُڑائی ہے نسیم سحری کی

اس رخش کو عباس سا اسوار سنبھالے
دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے

نرغہ میں جہاں پہلوؤں سے مل گئے بھالے
رہوار نے گویا پر پرواز نکالے

سب شامیوں سے بھر کے طرارا نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارا نکل آیا

صفت شمشیر

مُنہ تیغ کا ہے رشتۂ جاں کے لیے مقطع
مہر فلک فتح و ظفر کا ہے یہ مطلع

ہے حق کی عنایت سے کل اوصاف کا مجمع
جوہر کے جواہر سے ہوئی ہے یہ مرصع

ہوتے ہیں وہاں قافلے ارباب حفا کے * نابیں نہیں جاتے ہیں یہ صحرائے فنا کے

ہے تیز روانی میں کہیں سیل فنا سے
ہر مرتبہ آگے ہے وہ چلنے کی صدا سے
جھک جھک کے گلے ملتی ہے ارباب جفا سے
جب بڑھ کے ذرا چلتی ہے کہتی ہے قضا سے

رکتی نہیں روکیں کہ ستمگار نہ روکیں
اللہ کرے ہاتھ علمدار نہ روکیں

ہر وار میں گر گر کے لعلوں کا پھڑکنا
سناریوں پہ تیغ کے شعلہ کا لپکنا
وہ زیر علم جیمرۂ تاباں کا چمکنا
اڑنا وہ پھریرے کا وہ پنجہ کا لچکنا

تھا شور یہ ساعت بھی سدا یاد رہے گی
یہ شان یہ شوکت یہ وفا یاد رہے گی

دو چار صفیں جب تہ تیغ دوسر آئیں
مسدود جو تھیں جنگ کی راہیں نظر آئیں
اب ہاتھ جا حضرتیں اب زور پہ آئیں
یوں انگلیاں لپٹی ہیں کہ قبضہ میں نہ آئیں

واعقدۂ جاں کر دیا ہر ایک شقی کا
پھل تیغ کا ترشا ہوا ناخن ہے علی کا

بھر بھر کے لہو میں ہوئی تیغ دوسر آتش
کرتی نہیں دریا کو مضرت مگر آتش
ہے ناریوں کا خون کہ شعلہ ہے ور آتش
ہے بیچ میں پانی ادھر آتش ادھر آتش

غصہ کی حرارت ہے جو یہ حال ہوا ہے
ہے گرمئ رفتار کہ منہ لال ہوا ہے

جس دم وہ گری لاشوں سے رن پاٹ کے اٹھی
فوجوں پہ جھکی یاں تو قریں گھاٹ کے اٹھی
منہ اور کھلا جب وہ لہو چاٹ کے اٹھی
سر کیا ہیں زمیں کا بھی طبق کاٹ کے اٹھی

غصہ ہے یہ سرخی ہے کہ یاں خون عدو کی ❊ جوہر نظر آتا ہے ہر ایک کو نہ لہو کی

اب میان سے تیغوں کو نکلنے نہیں دیتے
عاجز ہے کماں تیر کو چلنے نہیں دیتے

پہلو بھی پیادوں کو بدلنے نہیں دیتے
گھوڑوں پہ سواروں کو سنبھلنے نہیں دیتے

لاکھوں کو دمِ تیغ زنی ٹوک رہے ہیں
بڑھتا ہے جو غصہ تو اُسے روک رہے ہیں

حضرت عباس کا لہر پر قبضہ

عباس کی صورت ہے کہ ہے قدرتِ باری
دریا کو یہ حیرت ہے کہ پانی نہیں جاری

دامن کی ہوا بن گئی ہے بادِ بہاری
اب اور قریب آ گئی ہے بڑھ کے سواری

نزدیک جو ہے نہر کلی دل کی کھلی ہے
ہے فوج کی کشتی کہ کنارہ سے ملی ہے

حرس سماعت میں نعرہ شیر

ہم گھاٹ تک آئے نہ کوئی سامنے آیا
سمرو عمرِ سعد نے بھی منہ نہ دکھایا

ہم نے تو لڑائی کا مزا خاک نہ پایا
دریا پہ بھی ڈھالوں کا سیہ ابر نہ چھایا

کیا نہر کا سب بھی مرے آجانے میں شک ہے
نیزوں کی چمک ہے نہ کمانوں کی کڑک ہے

دم لے کے بڑھے حضرتِ عباس دلاور
رہوار کو ٹھکرا کے گئے نہر کے اندر

دریا سے بہت دور نظر آتا تھا لشکر
دی بڑھ کے صدا مشک جو بھرنے لگے جھک کر

تم یہ نہ سمجھنا کہ پیے جاتے ہیں پانی
لو روکے آؤ کہ پیے جاتے ہیں پانی

اسی طرف سکینہ و مخدرات تک

ہر سو سے چلے آتے ہیں سب اہلِ ستم ہائے
لوٹتے ہوئے میداں سے چلے آتے ہیں لشکر

ہے خوف نہ کچھ جان کے جانے کا ہے وسواس
پانی کے پہونچنے سے مگر ہو گئی ہے یاس

نیزوں سے جو اہلِ سقر روکے ہوئے ہیں ❁ یہ مشک سکینہ یہ سپر روکے ہوئے ہیں

حضرت حسن مجتبیٰ المعال حرم کے پیاسے لال کی مرورت کا اظہار

گذرے ہیں کئی روز کہ پیاسی ہے سکینا
غم ایسے ہیں دل پر کہ مجھے شاق ہے جینا
تیروں سے عوض مشک کے چھانو مرا سینا
اے ظالموں بچوں سے نہیں چاہیے کینا

ہے قوتِ دل راحتِ جاں سبط نبی کی
پیاری وہی بیٹی ہے حسین ابن علی کی

جسم مبارک میں تیر لگنا مشک میں سوراخ ہونا اور عباس کا بچوں کی بے صبری پر تاسف کرنا

کیا کھینچ سکیں ہاتھ یہیں رنج ہے طاری
تھا فکر میں اس تیر کی وہ عاشق باری
مشکیزہ میں سوراخ ادھر کر گیا ناری
پانی جو بہا آنکھوں سے آنسو ہوئے جاری

اس مشک کو اشکوں سے بھگو یا کیے عباس
اس پیاسوں کی تقدیر پہ رویا کیے عباس

حضرت عباس کا وقت آخر امام کو آواز دینا

دی شاہ کو آواز کہ جلد آیئے بھائی
مشتاق ہوں صورت مجھے دکھلایئے بھائی
تکلیف مرے واسطے فرمایئے بھائی
اعدا ہیں بہت پاس ہٹا جایئے بھائی

خادم کا بھی قاسم کی طرح حال نہ ہو جائے
آقا یہ غلام آپ کا پامال نہ ہو جائے

امام حسین میں حالت مثالی تشریف لاتے ہیں

اے اہل ستم میرا مددگار کدھر ہے
کیوں بھائیو وہ عاشق سرشار کدھر ہے
جس پر یہ چلی ظلم کی تلوار کدھر ہے
یارو مرے لشکر کا علمدار کدھر ہے

بتلاؤ کہاں صاحب شمشیر کو مارا
کس وقت مصیبت میں مرے شیر کو مارا

جب شبِ قتلِ شہِ دیں کی سحر ہونے لگی

بند ۱۴۰ (در حال جناب حُرؑ)

شبِ عاشور تردد میں بسر کی حُر نے
بیم و اُمید کے عالم میں بسر کی حُر نے
عبد و فرزند و برادر پہ نظر کی حُر نے
من و عن اپنے ارادے کی خبر کی حُر نے

گو نہ کچھ صبر کیا اور نہ اصرار کیا
سب نے آقا پہ فدا ہونے کا اقرار کیا

مرحبا کہہ کے اُٹھا جلد وہ شیدائے امام
دوڑ کر پانی وضو کے لیے لے آیا غلام
حُر نے کی آہ کہ پیاسے ہیں شہنشاہِ انام
دل یہ بھر آیا کہ آنکھوں کے چھلکنے لگے جام

چیر رو رو کے وضو کر لیا ناچاری سے
پڑھ لیں دو رکعتیں خوف و غضبِ باری سے

سوچ کر کہنے لگا خیر میں سمجھا مطلب
دیر سے فکر میں تھا ذہن مرا اُلجھا اب
نوکری جاتی رہے گی مجھے اس کا ہے تعب
بولا حُر اب کسی مردود کا نوکر ہوں میں کب

دونوں ملعون ہیں مردود بھی ہیں ظالم بھی
تو بھی اک فاسق و فاجر ہے ترا حاکم بھی

میرا آقا ہے دل و جانِ رسولِ عربی
فخرِ والاحسبی مالکِ عالی نسبی
فاطمی و قرشی ہاشمی و مطلبی
سے وضو نام نہ لے کوئی کہ ہے بے ادبی

سارے آئینہ ہیں اسرارِ سماوات اُن پہ
خوب آگاہ ہیں تو ختم ہے ہر بات اُن پہ

بس خبردار نہ کچھ کہیو ابا سے نافرجام
تجھ سے بیہودہ سے بیکار کیے ہیں کلام

بے ادب کہنے لگا جلد زباں اپنی تھام
حکم دیدوں کہ تجھے گھیر لے یہ لشکر تمام

ابھی اسوار کمندوں میں جکڑ لیں تجھ کو
یہ پیادے مرے لشکر کے پکڑ لیں تجھ کو

سُن کے یہ حُر کے برادر نے جو بدلے تیور
پھر کے فرزند نے کی تیغ کے قبضہ پہ نظر

میاں سے جب وفادار نے کھینچا خنجر
جا کے خیمہ میں چھپا بھاگ گیا وہ خود سر

حُر نے دیکھا کہ قیامت کا ہے غصہ سب کو
ابھی موقع نہیں ہے کہہ کے یہ روکا سب کو

غیظ میں جھوم رہا تھا وہ بخیبت اختر
ناگہاں دیکھا کہ رانوں میں ہے گھوڑا پیچھن

دی صدا حُر نے کہ اے دشمنِ اولادِ حسین
لے میں جاتا ہوں تجھے ابنِ شہِ بدر و حنین

جس سواروں پہ تجھے ناز ہے تو کہیں مجھ کو
اور لعینوں کہ سے پیادوں سے کہ روکیں مجھ کو

یوں اُڑا وہ کہ دلِ طائرِ سدرہ پھر گیا
اور کرکا وہ کہ نالوں کا سُنا جب کرکا

ساتھ چلنے میں ہوا کا بھی کلیجہ دھڑکا
روکنا چاہا تو شعلہ کی طرح سے بھڑکا

عقل ہوا فوجِ عدو میں کہ جسے ری جاتا ہے
اُٹھ کے کرسی سے کہا شاہ حُر آتا ہے

گئے پھر پھر کے تعاقب میں جو آتے تھے سوار
سوئے پا بوسیِ شہ میں ہوئے گھوڑے پر وار

فوج سے بچ کے نکل آئے یہ چار و ناچار
وہ حُر سے قریب آ کے ہوئے دی رفتار

اب جو دیکھا تو حواس آ کے ہوئے جاتے ہیں
سامنے حضرتِ شبیر نظر آتے ہیں

دی صدائے کہ محبوب الٰہی کے حبیب
ماخذا تجھ سا ملا کھل گئے سب کے نصیب

بحر عصیاں کے تلاطم میں پڑا ہے یہ غریب
المدد اب مری کشتی ہے کنارہ کے قریب

تو اگر چاہے تو چک جائے بگڑا میرا
یار ہو جائے ترے لطف سے بیڑا میرا

خود پکارے شہ دل گیر کہ آبخش دیا
جو گنہ تھا رسولِ دوسرا بخش دیا

لے خدا نے بھی ترا جرم جو تھا بخش دیا
باغِ جنت تجھے اے ماہ لقا بخش دیا

تذکرہ ہوگا سدا اہل وفا میں تیرا
نام موجود ہے فردِ شہدا میں تیرا

سُن کے یہ باؤں سے لپٹا جو حُر نیک سرشت
نیست یہ ہاتھ دھرا کہہ کے مبارک ہو بہشت

حُر نے کی عرض اسی واسطے چھوڑا ہے کنشت
تجھے ان قدموں کے مل جائے زمیں دو بالشت

کفن اس دستِ کرم سے جو عنایت ہو جائے
مجھ سے عاصی کے لیے حلۂ جنت ہو جائے

رشید اور قصیدہ

غزل کے لیے سادگی زبان حسن محاورات۔ نزاکت خیال کی ضرورت ہے۔ مثنوی کے لیے واقعہ نگاری۔ طرز بیان تعلق و ترتیب درکار ہے۔ اسی طرح ہر صنف سخن ایک خاص طرز کی محتاج ہے۔ برخلاف اس کے قصیدہ کے لیے رعب الفاظ چستی بندش۔ بلندی خیال۔ سلاست تراکیب۔ درستی تشبیہ مگر یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر قصیدہ قصیدہ نہیں رہتا بلکہ اور کچھ ہو جاتا ہے اگر کسی قصیدہ گو میں مذکورہ بالا سب اوصاف کم و بیش موجود ہوں یا دو ایک ہوں تو اہل فن کے نزدیک قصیدہ گو کا اطلاق تو اس پر صحیح ہوگا مگر سمجھیں اس میں یہ صنف سخن ناقص تصور کی جائے گی۔

کامل قصیدہ گو | شعرائے اردو میں مرزا رفیع سودا نے قصیدہ کو قصیدہ کی حیثیت سے کہا اور اس کے قصائد اس میں جو ہوں یہ مجموعہ ہیں جو قصیدہ کے لیے ضروری ہیں۔ اور اس کے علاوہ قصیدہ کوئی ہو ذوق و عالب و مومن وغیرہم کی باری آتی ہے۔ ذوق بے شک ایک اور اصل شاعر تھے۔ اردو کا یا کیرہ روز مرہ دہلی میں یا تو میر نے کہا یا پھر اس کے بعد ذوق نے۔ مگر میں اس کو سودا کے سامنے کامل قصیدہ گو کہنے کو تیار نہیں حالانکہ اس کا پورا مجموعہ قصائد موجود ہے۔ جس میں جزالت الفاظ و تراکیب چستی بندش بلندی خیال سب کچھ پائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جن حضرات کی نظر سے فارسی کے چست قصیدہ گو مثلاً خاقانی انوری ظہیر فاریابی۔ عرفی۔ قاآنی وغیرہم کا کلام گذرا ہو اور بشرطیکہ وہ مذاق سلیم اور نظر صحیح بھی رکھتے ہوں۔ اس کے سامنے ذوق علیہ الرحمہ کے جزیل قصیدے شان الفاظ یا مجموعہ الفاظ و تراکیب کے جانے کے سوا اور کچھ وزن نہیں رکھتے۔ پڑھنے والے کا دماغ جزالت الفاظ کے دباؤ میں دب جاتا ہے

اور اُس کو بلندی خیالات یا خوبی نظم کی تدبیروں سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ اس کی غزل میں غزل کا مزہ آتا ہے مگر اُن کے قصائد میں قصائد کا لطف کامی نہیں ملتا +

رہے غالب وہ اُردو کے قصائد ہی میں نہیں بلکہ غزل میں بھی اکثر فارسی کے چست گو مثلاً عرفی و ظہیری کی بلند خیالیوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اُن کے فارسی کلام کا کیا ذکر۔ اس لیے اُن کے مختصر اُردو کے قصائد میں پڑھنے والے کو فارسی کے قصیدہ گویوں کی جھلک نظر آتی ہے حیثیت خیال اُردو کا وہی قصیدہ۔ قصیدہ ہے جس کو پڑھ کے کم از کم فارسی کے قصائد کا لطف آ جائے۔ ورنہ نظم سخن کے لیے تو بڑی کشائش ہے +

غزل گو اُردو زبان پر احسان کرتا ہے۔ خلاف اس کے اُردو کا ایک سچا قصیدہ گو علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھتا ہے۔ اس کی قوت دکھاتا ہے۔ ملت ترکیب کی خوبیوں کے علاوہ بلندی فکر کے جواہر پیش کرتا ہے۔ خاقانی نے فقط اُردو زبان پر احسان نہیں کیا بلکہ تخیل شعر پر احسان کیا۔ ذوق نے فقط فکر قصیدہ سے علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھا مگر اپنی غزل گوئی سے زبان اُردو کی پرورش کی۔

صحت قصیدہ خوانی اور رشید

جناب رشید نے عموماً قصائد نہیں کہے اور نہ اُن کو ضرورت تھی۔ اگر کسی رئیس کی تعریف مقصود ہوتی تھی تو اُس کے لیے رباعی کے چار مصرعے کافی تھے۔ وہ مداح امام تھے۔ مداح عوام نہ تھے۔ مگر سال میں ایک قصیدہ ضرور کہتے تھے اور عرصے سے ماہ پندرہ شعبان المعظم کو (جو ولادت آخر الزمان کی صبح ہے) دریا میں ڈالا کرتے تھے۔ اور اُس کے بعد اُسی وقت اپنے مکان ہی پر پڑھا کرتے تھے۔ ایک معقول مجمع ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سے مشتاق کلام نہیں سُن سکتے تھے کیونکہ وقت بہت نازک ہوتا تھا اس وجہ سے جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ جلالہ ہند مغفور

دوسرے یا تیسرے روز اپنے مکان پر ۸ بجے صبح کو ایک محفل تیئے قرار دیتے اور رشید وہی نیا قصیدہ دوبارہ پڑھتے تھے۔ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کثرت سامعین کی وجہ سے مغفور کے وسیع مکان میں گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور لوگ دروازہ کے باہر تک کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ رشید نے سوائے خاندان رسالت کے کسی دوسرے کو اپنا ممدوح نہیں بنایا۔ اس لیے صرف مدح ائمہ میں قصائد ملتے اس کے سوا کچھ نہیں +

یہ قصیدے نہایت سلیس اُردو زبان میں ہیں۔ غزل کے شوخ مضامین سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اُن کے قصائد میں بیشتر وہ شان نہیں پائی جاتی جو محققین سخن نے قصائد کی تعریف میں ناگزیر لکھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رشید کے قصیدے بھی زبان اُردو اور محاورات انیس کے عمدہ نمونے ہیں۔ ذیل میں رشید کے چند قصیدوں کا اختصار درج ہے۔

انتخاب قصائد

در مدح امام دوازدہم علیہ السلام

رہیں ہم بحر عالم میں نہیں یہ بات امکاں میں	۱	ٹھہر سکتے نہیں ہیں آکے آنسو چشم گریاں میں
کبھی کنگھی جو کرتے آپ کی زلف پریشاں میں	۲	پریشانی نہوتی حضرت یوسف کو زنداں میں
نہیں جو آپ کا قائل وہ مذہب کچھ نہیں رکھتا	۳	معین ہوگئے ہیں رکن آخر آپ ایماں میں
خدا نے ابتدا اور انتہا کا دھیان رکھا ہے	۴	رسول اللہ کا ہے اور تمہارا نام قرآں میں
نبی فرماتے ہیں جب دیکھتے ہیں وہاں چمن اپنا	۵	ابھی اک پھول اور آئے گا جنت کے گلستاں میں
تصور میں قریں حضرت کے یوں انصار رہتے ہیں	۶	تعلق جس طرح سے ہے دہن میں دندان میں
اگر نار غضب تیری اجازت لیلے رحمت سے	۷	ہمیشہ ابر تر سے آگ برسے فصل باراں میں

خوشی نہ آپ کے آنے کی ہے سارے زمانہ کو
کہ اب تو لوگ باتیں کرتے ہیں اس شہر خموشاں میں

بھلا یہ کون کہتا ہے کہ محتاجی کا عالم تھا
گھر تم سے بھرے تھے حیدر صفدر کے وہاں میں

کیا ہے تم نے مداحوں کا سلطان ہمیں بلا لو
قیامت ہے کہ میری قبر ہو گور غریباں میں

ہمشیر آقا سے کہہ وہ ناخدا ہیں بحر عالم میں
بہت جلدی خبر لیجے مری کشتی ہے طوفاں میں

ایضاً

آ گئے جب تم تو بالکل فیصلہ ہو جائے گا
کفر سے دیں اک اشارہ میں جدا ہو جائے گا

آپ کا آپ جب عالم سیاہ ہو جائے گا
پاؤں کی آواز سے محشر بپا ہو جائے گا

کچھ ہمیں پر اٹھیں ہے گر چھپائے گا نقاب
ماہ نو تیرا کریاں نہاں ہو جائے گا

ہونگے پھولوں سے زیادہ آپ کے نقش قدم
گلشن جنت در دولت سرا ہو جائے گا

آپ کہلا بھیجیے گا صبر کرتا ہوں میں
ایک دنیا میں سا مرا نالہ رسا ہو جائے گا

کر کہوں گا آپ میری التجا سنتے نہیں
اے معاذ اللہ مولا سے گلا ہو جائے گا

مصلحت ہوگی تو تم کو بھیج دے گا کبریا
آج ہو موعود کل وعدہ وفا ہو جائے گا

جب اٹھیں گے صور اٹھ کر قبر سے دوڑیں گے ہم
شور محشر میں گھوڑے کا اصلا ہو جائے گا

کرب میں ہے اور بلا میں لیجیے جلدی خبر
ورنہ آخر نام دل کا کربلا ہو جائے گا

جلد تر پہنچانے کو میرا عریضہ آپ تک
تیر بنتے بنتے سب دریا ہوا ہو جائے گا

سوئے شہ جانے کو ہیں سب ضعف سے کہتا ہوں میں
مجھ کو اٹھنے دے روانہ قافلا ہو جائے گا

آ گئے جب تم تو دشمن دیکھ لیں گے میں ہوں گا شاد
وہ برا مانیں گے اور میرا بھلا ہو جائے گا

کفر سب عالم میں پھیلے جلد کہتا ہوں رشید
جانتا ہوں اس سے میرا مدعا ہو جائے گا

رباعی و سلام

رباعی جس قدر فصاحت اور بلاغت آمیز کلام سے مالا مال ہو اُسی قدر اُس کی عمدگی ہے۔ خصوصاً چوتھے مصرعہ کو اس طرح صاف اور بے تکلف ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کے دل پر وہ مضمون اثر کر جائے جس کے لیے چار مصرعے کہے گئے ہوں کیونکہ باقی تین مصرعے فقط چوتھے کے خیال کو پورا کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔

شعرائے اُردو اور رباعی

جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُردو شاعروں میں رباعی کے حق میں کوئی اتنا کامیاب نظر نہیں آتا جتنا مرتبہ گو حضرات۔ ظاہر وجہ یہ ہے کہ علاوہ مرثیہ گویوں کے دوسرے شاعروں نے رباعیات صرف تفنن طبع کی غرض سے کہی ہیں کہ انھیں اس صنفِ سخن میں زمانہ معذور نہ سمجھے ورنہ رباعی کا صرف اُن کے لیے مفقود ہے۔ ہر مشہور شاعر غزل گو نے رباعیاں کہیں مگر بہت کم۔

لیکن خلیق۔ انیس۔ مونس۔ جریر۔ عشق۔ تعشق۔ نفیس۔ رشید۔ عارف۔ اوج۔ یا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے کلام میں رباعیات کا بھی کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ کیوں۔ یہ اس وجہ سے کہ مرثیہ گو جب نیا مرثیہ پڑھنے منبر پر بیٹھتا ہے تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے کہ سامعین کو مضامین مرثیہ سننے کے لیے پہلے آمادہ کرے۔ اور اُسی کے بعد مرثیہ شروع کرے کیونکہ اگر فوراً ہی بغیر رباعیات و سلام مرثیہ شروع کر دیا جائے تو سامعین کو متوجہ ہوتے ہوتے بہت سے اُن مصرعوں کا خون ہو جائے جو شاعر نے خون جگر صرف کر کے کہے ہیں میری غرض یہ ہے کہ رباعیات و سلام مرثیہ کے لیے وہی کام دیتے ہیں جیسے ایک عمدہ نثر کا تمہیدی حصہ جو پڑھنے والے کو آنے والے مضامین کی اجمالاً خبر دیتا ہے اور اُس کے اشتیاق کو بڑھا دیتا ہے رشید نے بہت رباعیاں کہیں۔ مگر اُن سب میں مضامین پیری کے متعلق جتنی ہیں اُتنی کسی دوسرے مضامین کی نہیں پائی جاتیں۔ ذیل میں رباعیات و سلام کا انتخاب درج ہے۔

انتخاب رباعیات متعلق پیری

پیری و بیچارگی	دل کو سو سو طرح کے غم کھلتے تھے دو جانے کا جوانی کے ہی عقدہ بیکار	پیری جو رشید آئی ہی آنے دو دیکھو اپنی طرف بس اب جانے دو
آرام لحد اور مقصد حیات میں حوبی تفاوت	پیری سے ہیں خم راہ جناں کیونکر لیں لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ ستاؤ	اک عمر بھرے ہیں دم ذرا دم بھر لیں چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں
جوانی کا غم	مدت سے جوانی کا الم باقی ہی یوں جھک کے جوانی سے ملا وقت وداع	اک عمر سے یہ نشان غم باقی ہی جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہی
شکایت فلک	پیری میں خمیدہ کر دیا ہی تو نے سیدھا ہونے دے اب تو اے پیر فلک	ظالم کیسا ستم کیا ہی تو نے اپنا سا مجھے بنا لیا ہی تو نے
پیری عاجز	پیری نے جوانی کی جو دولت لے لی لاحول ولا قوۃ الا باللہ	گویا مرے قتل کی اجازت لے لی ظالم نے توانائی و طاقت لے لی
امید جنت	نامی ہوئے بے نشان ہونے کے لیے کی موت قبول خواہش جنت میں	افسانہ ہوئے بیان ہونے کے لیے ہم پیر ہوئے جوان ہونے کے لیے
حمیدگی کمر اور حس علیل	آخر ہوں دم فراق پاتا ہوں میں پیری سے نہیں ہوں خم سفر ہی نزدیک	ہستی سے عدم کی سمت جاتا ہوں میں دل بیٹھ گیا جھک کے اٹھاتا ہوں میں
پیری اور یاد مرگ	بیتاب ہی یہ قلب حزیں اپنی طرف پیری میں جھکے جانے کا باعث یہ ہی	اور روح کو آرام نہیں اپنی طرف اب کھینچتی ہی ہمکو زمیں اپنی طرف

یادِ جوانی	پیری سے خاک مہربانی نہ ہوئی یوں توڑتا دم کہ دیکھنے لوگ آتے	وقتِ آخر بھی کامرانی نہ ہوئی افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی
پیری اور حسنِ باطل	پیری میں رشید یہ بدآئینی ہے آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ	بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے اب تک تم کو خیالِ خود بینی ہے
دعویٰ وقت کی دعوا ناں	کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں	کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں
جوانی سے ناں	پیری کہ یا موت کی لستانی پہنچی رستہ میں بھی ملنے کی توقع نہ رہی	مردیکہ اب مرگِ ناگہانی پہنچی ہم اب چلے جب دورِ جوانی پہنچی
پیری اور صبر	طفلی تو گئی اُسے کیا جانیں ہم پیری نے یہ حال کر دیا آنکھوں کا	پائیں نہ کہیں خاک بھی گر چھانیں ہم ملجائے جوانی تو نہ پہچانیں ہم
کہا ہوں ۔ ہ سب کی شاعرانہ معذرت	ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ زمانے ہیں قربت میں گنہ اپنے بیاں کرکے رشید	سمجھوں گا ۔ مرے پاس بھی گھاتیں ہیں کہدوں گا جوانی کی یہ سب باتیں ہیں
پیری اور تخفیف تکلیف	پیری میں عبادت کی کہاں طاقت ہے پیروں پہ خدا نے کی ہے تخفیف رشید	سچ پوچھتے ہو گر تو فقط ہمت ہے دیکھو کہ نماز صبح دو رکعت ہے
حسرت گی کمزور افسوس	ملتے ہیں دلِ غم پہ کل جیتا ہوں ہر بار خمیدہ ہوتی جاتی ہے کمر	رعشہ پیری سے کب ہے سر دھنتا ہوں جھک جھک کے صدائے آہِ دل سنتا ہوں
علامت پیری	جھریاں وہ بلائیں جان پڑتی ہیں پیری کا بڑھا ہے زور کیا دیکھوں میں	یہ برچھیاں پتھر میں بھی در آتی ہیں آئینہ میں جھریاں نظر آتی ہیں

پیری اور جوانی سے مدعا

پیری وہ ہے کہ جس کا ہوں میں
اے بھائیو مہمان تمہارا ہوں میں
چھپ جاؤں نظر سے ہے وہ ہنگام قریب
وقت اور ہے اصبح کا تارا ہوں میں

پیری اور جوانی

دیکھی بس سب کی مہربانی ہم نے
سن لی اک اک کی لن ترانی ہم نے
رکھتا نہ وہ دل جس میں تھیں لاکھوں باتیں
طے کر دیا قصہ جوانی ہم نے

انقلاب

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا
کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری
پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا

یاد جوانی

کیوں جا کے سوئے عالم فانی آتی
مغرور اگر تھی نہ جوانی آتی
کہتا جب میں ذرا دکھائے صورت
اے کاش صدائے لن ترانی آتی

سلاموں کا انتخاب

ہیں بر میں صبر کو شہ خوشخو لیے ہوئے
جاتا ہے دل کو تیر سے پہلو لیے ہوئے
کہتے ہیں شاہ لیتے ہیں اکبر جو کروٹیں
امت کی بھی نجات کا پہلو لیے ہوئے
جنس ثواب بکتی ہے میدان حشر میں
ہم بھی کھڑے ہیں توڑے سے آنسو لیے ہوئے
میرے گناہ تولتی ہے رحمت خدا
قدسی الگ کھڑے ہیں ترازو لیے ہوئے
اس فوج سے نہ کیوں دل شبیر ہو قوی
جس کا نشاں ہو قوت بازو لیے ہوئے
خیمہ سے لاش لے چلے اکبر کی جب حسین
ماں دوڑی آئی ہاتھوں پہ کینو لیے ہوئے

طوق آہن عابد دلگیر کا وسواس ہے
خیر مقدم خانۂ زنجیر میں آواز ہے
ایک معصومہ کی عصمت جلوہ فرما ہے جہاں
حضرت مریم کی عصمت فرش پا انداز ہے
منہ لے اتنے زخم کھائے اس میں کتنے رخنے ہیں
دل کے ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑے میں کلکا ناز ہے

زخم کھانے ہی علی اصغر کرینگے انتقال
تیر مرغ روح کو گویا پہ پرواز ہی

مرے جاتے ہیں علی اکبر جوانی ہی شروع
عمر کا انجام ہی اور سبزہ کا آغاز ہی

جو کہوں گا نوکرے گا دمبدم کہتے تھے شاہ
اے مرے مالک مجھے رحمت پہ تیری ناز ہی

یاد اصغر بھی ہی شہ کو زخم کھانے کا بھی شوق
دل لیے جاتی ہی ایسی تیر کی آواز ہی

روکتا کون اہل کیں کو ایک بھی یاور نہ تھا
لوٹنے جب آئے تھے ظالم کوئی در پر نہ تھا

چین کیا پاتے حرم رنداں کچھ اپنا گھر نہ تھا
اوجھی بچھی تھی زمیں تکیہ نہ تھا بستر نہ تھا

کس سے پوچھوں دشت میں کیا گیا کیوں زیر تخت
زانوئے زہرا پہ جو رکھا تھا وہ سر نہ تھا

کربلا تک لے گئی تھیں پھر کے جب پہنچیں وطن
ماں کے ساتھ اکبر نہ تھے اور گود میں اصغر نہ تھا

بعد قتل شاہ دیں ہر ایک کا تھا دل لہو
بس کے نیچے خوں نہ ہو ایسا کوئی پتھر نہ تھا

جنگلوں میں روز و شب پھر پھر کے کہتے تھے حرم
یوں ہوئے بے گھر کبھی جیسے ہمارا گھر نہ تھا

کٹ گیا سر شہ کا ڈوبی کشتی آل رسول
ناخدا بیچارہ تھا بیمار اور لنگر نہ تھا

پوچھ کے رضوان سے کیوں سا تا جناں میں اے رشید
واہ وا کہا میں غلام حضرت قنبر نہ تھا

خوشی سے زخم کھاتے یوں شہ دلگیر آتے ہیں
ڈر ہے جاتا ہی دل جب سامنے سے تیر آتے ہیں

نکل آئی ہیں موجیں کوثر و تسنیم سے باہر
بھر آئی ہی ماں سے حضرت شبیر آتے ہیں

سحر کے بعد سب کر کیں کمانیں شہ نے فرمایا
علی اصغر گئے وہ سامنے اب کیوں تیر آتے ہیں

کہتے ہیں شاہ دیں سے کر کھڑی ہیں منتظر بانو
میاں ہی دیکھیے کب اصغر بے شیر آتے ہیں

نہ نکلے اس سے بی بی لالہ یہ ہی منظور عابد کو
فقط اسوا سے تھامے ہوئے زنجیر آتے ہیں

آرے ایں رن میں اکبر دوڑتے ہیں ہر طرف
سامنے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

کس طرح دل جاں زہرا سے سنبھالا جائیگا
تیر کیونکر حلقِ اصغر سے نکالا جائے گا

یہ سمجھ کر لے گئے ہمراہ اصغر کو حسین
قید میں بانو سے یہ بچہ نہ پالا جائے گا

روکیا اکبر کو تم زینب سے کہتے تھے حسین
اذن اگر مانگا بہن مجھ سے نہ ٹالا جائے گا

سب وصیت کر کے شہ سر کے کہا سجاد نے
مجھ سے یہ بچوں کا گھر کیونکر سنبھالا جائے گا

کہتے تھے سب بنتا تھا عابد کا سب طوق گراں
ہائے یہ گردن میں کس سکیں کی ڈالا جائے گا

رو کے فرماتی تھیں زہرا گود میں تھے جب حسین
میرے بچے بے خطا تو مار ڈالا جائے گا

کہتے تھے عابد مٹے تلووں کے سارے آبلے
پر قیامت تک نہ دل کا کوئی چھالا جائے گا

شور ہی جلو میں سر لیتے ہیں اصغر کا لہو
حشر آجائے گا جب یہ خوں اچھالا جائے گا

مرثیے جائیں گے ہم قبر میں بھی اے رشید
یہ ہمارے ساتھ جنت کا قبالا جائے گا

شیخ بوبیہ

غدر کے بعد سے لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا جس کی ہوائیں اہل کمال کا طواف کرتی تھیں اور اُن کو اپنے آغوش سے جدا ہونے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے وہ اہلِ دولت جن کے قدر شناس ہاتھوں نے کمال کی مختلف تصویروں پر زریں بچھاور کیں تھیں۔ آج اپنے سینوں پر خالی ہاتھ رکھے لکھنؤ کے ویران و بے نشان قبرستانوں میں آرام کر رہے ہیں اور اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گذرنے والوں کو کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کا زبردست حکم یاد دلاتے ہیں۔ لکھنؤ کا گیا گذرا زمانہ تھا اور کمال کا دلی وقت تھا۔ کہ پھر بھی آتش و ناسخ کے معتمد الدولہ بہادر نے ایک معتبر بکمیشت رقم دیکر کہا کہ میرا اب وہ زمانہ نہیں ہے جو آپ لوگوں کی خدمت میں ماہانہ پیشکش کیا کروں۔ لہذا یہ رقم بکمیشت قبول فرمائیے۔ ناسخ مغفور چونکہ ایک تاجر کے فرزند تھے۔ انھوں نے روپیہ کی قدر کی۔ اور ہرن کی سراے میں دکانیں اور مکانات خرید کے

اپنی آئندہ زندگی کمال کی بدولت آرام و آسائش سے گذاری۔ رہے آتش مرحوم وہ ہمیشہ کے مست خیال تھے کبھی دولت کی پروا کی ہوتی تو یہ روپیہ بھی رہتا۔ ایک ہی سال میں کھا کھلا کے بیٹھ رہے۔ اور پھر وہی مفلس آتش ہو گئے۔ خواجہ سعدی کے قول کو قوی کیا۔ ایک شاعر نے کہا دوسرے نے ملا دنیا کو دکھا دیا کہ ؎

نیم نانے گر خورد مردِ خدا　　بذل درویشاں کند نیمے دگر

مرکز و مدار اہل کمال

وہ زمانہ آ لگا تھا کہ انیس ایسا مستغنی المزاج بھی ایک دفعہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ صیافت کرنے والوں نے قدر شناسی اور عزت کمال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر پھر بھی لکھنؤ کی گری ہوئی ہوا انیس کو جلد سے جلد حیدرآباد سے اپنے مرکز پر کھینچ لائی +

یہ ضرور ہے کہ اہل کمال کو ہوس زر سے مستغنی ہو جانا چاہیے مگر ضرورت زمانہ کسب معاش۔ بار رشِ عیال ترک وطن پر مجبور ہی کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کی خاک اب بھی اہل کمال کے پیدا کرنے میں قاصر نہیں۔ مگر اس دورِ ناگوار سے مجبور ہو کر ان کی وقتی جدائی گوارا کر لیتی ہے +

رشید کا نقد کمال جب لکھنؤ کی کسوٹی پر ایک نمایاں رنگ دینے لگا تو ہندوستان کے شیعی حلقوں میں ان کے کلام کے سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور خود رشید کے ضروریات زندگی بھی کثرت تسلیمات سے وسیع ہوتے گئے۔ پہلے جو حضرات لکھنؤ کے باہر رشید کے کلام کے مشتاق ہوئے وہ دو بزرگ نواب صفدر حسین خاں صاحب اور نواب ترصد حسین خاں صاحب شیخ پور حسین آباد کے تھے۔ ان حضرات کے یہاں رشید مدت تک جاتے رہے۔

رشید رامپور میں

وہ وقت ہے کہ نواب مشتاق علی خاں بہادر کا مرحوم کا انتقال ہو چکا ہے اور جنرل اعظم الدین خاں کا دور دورہ ہے۔ موجودہ نواب عالی وقار نابالغ ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جنرل مذکور انتظام ریاست کے لیے مقرر ہوئے ہیں +

نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم خلف نواب محمد سعید خاں بہادر نواب کلب علی خاں صاحب بہادر (خلد آشیاں) کے چچا تھے۔ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے۔ اور مجلس محرم اور تعزیہ داری کی رسم رامپور میں ادا کرتے تھے +

جب ۱۸۸۷ء میں نواب مشتاق علی خاں صاحب بہادر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اپنے اجداد کے بنا کردہ امام باڑہ کو پھر ذکر حسین سے آباد کیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اُن مرحوم کے بعد بھی جناب عالیہ مغفورہ کے انتقال ریاست کے امام باڑہ میں محرم کی مجالس برابر ہوتی رہیں۔ چنانچہ تقریباً ۱۸۹۴ء میں نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے جنرل مذکور نے جناب رشید کو مجلس محرم پڑھنے کے لیے طلب کیا۔ ریاست کی طرف سے جناب رشید کی بہت خاطر مدارات ہوئی۔ دونو وقت خاصہ کا کھانا اور اشیاء ضروری بھی بافراط مہیا رہتے تھے +

نواب رامپور اور جناب رشید

اُس وقت عالی جناب نواب حامد علی خاں بہادر بالقابہ بغرض تبدیل آب و ہوا یعنی نینی تال پر رونق افروز تھے۔ صرف جناب رشید کو سننے رامپور تشریف لائے جس کا اظہار خود وقت ملاقات فرمایا۔ یعنی نواب صاحب نے جناب رشید سے فرمایا "میں آپ کو سننے کے لیے پہاڑ سے آیا ہوں"۔ جناب رشید نے جواب میں عرض کیا "تمنا قدردانی"۔

اُس وقت یہ وسیع قلعہ نہ تھا بلکہ طرز قدیم کے موافق ایک چار دیواری تھی اور بڑے دروازہ پر ایک توپ لگی رہتی تھی۔ اس دروازہ کے قریب پرانا امام باڑہ تھا جس کا نشان

اب نہیں پایا جاتا۔ صرف چند گذشتہ والیان ریاست کی قبریں جالی دار چوکھٹے میں ڈھکی نظر آتی ہیں۔ نواب حامد علی خاں صاحب بہادر نے مچھی بھون کے جانب جنوب ایک خوشنما امام باڑہ معہ ایک مختصر مسجد کے تعمیر کرایا ہے۔ اس میں معہ شاہ نشین تین درجے ہیں۔ سب سے آخر یعنی شاہ نشین پر چاندی کی ایک بڑی اور خوشنما ضریح رکھی ہے اور اس پر سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ نصب ہے۔ ماہ محرم میں اس ضریح کے دونوں طرف دوسری ضریحیں اور علم رکھے جاتے ہیں۔ بیچ کے درجہ میں ایک بڑا چاندی کا ممبر ہے اسی درجہ میں شاہ نشین کے متصل نواب صاحب سیاہ مسند پر ماہ محرم میں تشریف فرما ہو کر شریک مجالس ہوتے ہیں +

امام باڑہ کے آگے ایک وسیع چبوترہ ہے جس کا منظر مغربی جانب مسجد کے صحن سے ملتا ہے +

المختصر جناب رشید نے مجالس پڑھنا شروع کیں پہلی مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا۔

دفن علی اصغر سے جو فرصت ہوئی تھی کو

چھ سات سو آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا جس میں بیشتر اراکین ریاست ہوتے تھے +

جناب رشید کی صحت	جناب رشید نواب صاحب کی نکتہ رس طبیعت کی تعریف فرماتے تھے اور تعجباً کہتے تھے کہ سرکار ایسی برمحل داد دیتے تھے کہ مجھ کو حیرت ہوتی تھی +

ایک روز جناب رشید مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ اثناء خوانندگی میں نواب صاحب نے فرمایا "آپ کو ہدیۃً تکلیف کرنی ہوگی" جناب رشید نے عرض کی "حضور دیکھا جائے گا" نواب صاحب نے پھر فرمایا "نہیں نہیں وعدہ کیجیے" ابکی جناب رشید کے الفاظ تھے "حضور ایسا حکم ہوگا" سہ بارہ نواب صاحب نے فرمایا "آپ وعدہ کیجیے" جناب رشید نے عرض کی "بہت خوب"

عطائے خلعت

چنانچہ حسب وعدہ جناب رشید ہر سال تشریف لیجایا کیے۔ نواب صاحب کے
با اختیار ہونے پر بھی دو سال تشریف لے گئے ہیں۔ پہلے سال جب برائے حصول رخصت
جناب رشید مچھی بھون میں تشریف لے گئے تو نواب صاحب نہر میں حمام کر رہے تھے
اطلاع ہوئی بلا لیا باتیں کرتے رہے۔ اور جب نہا سے فارغ ہوئے دربار میں تشریف
لائے اور حکم دیا۔ کہ ایک خلعت مع شالی رومال جناب رشید کو عطا ہو + عطائے خلعت
رشید کے لیے مخصوص تھی ورنہ رامپور میں خلعت دینے کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی جناب رشید کو
ہر سال تین پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ ایک سال نواب صاحب کو رشید کا کلام بہت
پسند آیا وقت ملاقات جوش مرحمت میں فرمایا "جب میں با اختیار ہونگا تو بہت کچھ دونگا"
ایک سال ریاست سے طلب کا تار نہ آیا لہذا پھر نہ گئے +

رشید علم آباد میں

عظیم آباد میں شیعوں کی بیشتر تعداد انیس کے ماننے والوں کی ہے۔ اور خود انیس
مرحوم نے وہاں بڑے بڑے معرکہ کی مجالس پڑھی ہیں۔ دبیر کے شیدائی بھی ہیں مگر غالباً کم +
یہ ابتدا ہی سے مشہور تھا کہ رشید اپنے نانا انیس کی زبان کہتے ہیں۔ لہذا وہاں کے
لوگوں میں جیسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے ظاہر ہے + اس بنا پر رؤسائے شہر سے لوگوں نے
خواہشیں کرنی شروع کیں کہ جناب رشید بلائے جائیں۔ چنانچہ جناب چھوٹے
نواب صاحب برادر خرد جناب بادشاہ نواب صاحب نے اپنے ملازمین مع خط طلب
روانہ کیے۔ مگر جناب رشید نے انکار کیا۔ بالآخر شاہ ۱۳۲۸ھ میں رشید کے
ایک دوست جناب بین صاحب رشید کو لے گئے اور اپنے یہاں ایک مجلس پڑھوائی
بعد ختم مجلس نواب صاحب مذکور نے بذریعہ رفقا رشید سے وعدہ مجالس لینا چاہا
انھوں نے فرمایا "انشاء اللہ" نواب صاحب کو اس جملہ شرطیہ انشائیہ سے اطمینان نہوا

اور وقت پر خود جناب متن صاحب کو منتخب کیا کہ لکھنؤ جا کے جناب رشید کو لائیں چنانچہ اس سال متن صاحب لکھنؤ آئے اور جناب رشید کو باصرار لے گئے۔ باؤلی کے امام باڑہ میں مجالس ہوئیں۔ یہ وہی امام باڑہ ہے جس میں انیس کے آیات کمال کا اظہار ہو چکا ہے۔ میر نواب صاحب مونس۔ و میر ہادی صاحب وحید جس میں برسوں پڑھے ہیں۔ رشید کے لیے اُس ممبر پر پڑھنا باعث فخر تھا۔ جو اُن کے جدِ کامل انیس کا قدم آشنا تھا۔

جب رشید پہنچے مجلس منعقد ہوئی۔ سارا عظیم آباد جمع ہو گیا۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جن میں اہلِ ہنود پانسو سے کم تعداد میں ہوتے تھے۔ رشید وہاں ایک عشرہ پڑھتے تھے۔ دو بجے مجلس شروع ہوتی تھی اور چار بجے ختم ہوتی تھی۔ سامعین اس قدر محظوظ ہوتے تھے کہ مرثیہ کہیں سے چھوڑنے نہیں دیتے تھے۔ بعد مجالس نواب صاحب ساڑھے سات سو روپیہ دیتے تھے۔ اور بہت اعزاز و اکرام فرماتے تھے۔ رشید نے انتقال کے دو سال قبل عظیم آباد جانا خود ترک کر دیا تھا۔ وجہ عذر پیری۔

رسد حیدرآباد میں | عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں حیدرآباد میں بڑی بڑی نامی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں۔ ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے نامی ذاکر بیشتر یہیں آئے اور آتے ہیں۔ نفیس مرحوم کے بعد جناب عارف مرحوم نے اپنے کامل نانا کی جگہ لی۔ اور ہر سال جانے لگے۔ وہاں کے نکتہ رس حضرات نے جناب نواب مذکور سے جناب رشید کے سننے کا شوق ظاہر کیا۔ لہٰذا تحریک طلب کی گئی۔ مگر تحریری جس کا کوئی نتیجہ نہوا۔ دو سال برابر جناب رشید کے نام تار آیا۔ مگر انھوں نے باوجود تنگی معاش

وہاں جانے سے انکار کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک روز جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ مغفور نے مؤلف سے ایک روز فرمایا۔ کہ جناب رشید سے ہمارے جو دوستانہ تعلقات ہیں اُن کو کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر امر میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں دُنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مگر میرا کہا نہیں ٹالتے۔ مگر ایک موقع پر مجھ کو بڑا تعجب ہوا جبکہ جناب رشید کے پاس دوسرا طلبی کا تار آیا تھا۔ وہ تار لیے ہوئے فوراً میرے پاس آئے اور مجھ سے استشارہ کیا۔ میں نے اُن کے اخراجات کی زیادتی اور ذرائع آمدنی کی کمی پر نظر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ فوراً چلے جائیے۔ جناب رشید سے اور مجھ سے اس پر ایک طویل گفتگو ہوئی۔ وہ کہتے تھے اگر میں وہاں گیا تو ممکن ہے کہ کچھ خاندانی رنجشوں کا باعث ہو۔ میں کہتا تھا کہ آپ کو صاحب مجلس خود با صرار بلا رہے ہیں۔ کسی کو شرارت کی گنجائش ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔

دوسروں کے جذبات کا خیال

جناب رشید چونکہ مرنجاں و مرنج مزاج کے بزرگ تھے اُن کو خیال آیا کہ اگر میں نواب بہرام الدولہ کے یہاں جانے کا نہ بہت ممکن ہے کہ وہ دوسرے دوستوں میں سے کسی کی کمی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جناب علی محمد صاحب عارف ہی ہوں۔ بے شک یہی مصلحت تھی اور کچھ نہ تھا۔ ورنہ رشید کے لیے وہ وقت آزمائش تھا۔ روزانہ قرضدار ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہ اخراجات اول تو بہت کم تھے۔ اور اگر ملتے بھی تھے تو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا۔ کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس سے باہم دلوں میں کسی قسم کا رنج پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی کی آخری ساعت تک اُنہوں نے اس امر کو ملحوظ رکھا۔

سفر حیدرآباد اور جناب رشید

بہر حال جب نواب مذکور کی متواتر تین سال کی طلب پر بھی رشید نہ گئے تو اُن کے معتمد میر بادشاہ علی صاحب ضیا مرحوم نے عرض کی۔ حضور وہ اس طرح

بلانے سے کبھی نہ آئیں۔ تو جب تک میں اُن کے لیے خاص کوشش نہ کرونگا۔ چنانچہ
میر صاحب موصوف سے اور حکیم میر باقر حسین صاحب مغفور سے جو لکھنؤ کے ممتاز اطبا
میں سے تھے۔ باہم دوستانہ مراسم تھے۔ لہذا اُنھوں نے حکیم صاحب کے پاس خط
بھیجا اور اُن سے سفارش چاہی کہ وہ جناب رشید کے پاس بذاتِ خود جائیں اور
اُن کو سفر حیدرآباد کے لیے مجبور کریں۔ حکیم صاحب چونکہ جناب رشید کے ساتھ کے
پڑھے ہوئے تھے اور بے تکلف دوست تھے۔ اس لیے بادشاہ علی صاحب کی تحریر کے
مطابق فوراً رکابگنج تشریف لائے اور جناب رشید سے کہا۔ دیکھو بھائی میں
تمہارے پاس آیا ہوں اب تمکو حیدرآباد ضرور جانا ہوگا۔ اگر اب انکار کروگے تو میرے
رنج کا باعث ہوگا۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب قبلہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اُن کی مزید
تائید نے جناب رشید کے لیے انکار کی گنجائش نہ رکھی۔ صرف استخارہ بنا ٹھیری
اور جناب مولانا کی مقدس تسبیح کے ذریعہ سے مصلحت خدا نے بھی موافقت کی۔ دوسرے
روز حکیم صاحب نے میر بادشاہ علی صاحب کو کہدیا کہ رشید تشریف لائیں گے
طلب کا تار اور مصارف سفر بھیجدیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تار اور دو سو روپیہ آئے
جناب رشید لکھنؤ سے حیدرآباد پہنچے۔ اسٹیشن پر نواب بہرام الدولہ بہادر کے
فرزند ارجمند نواب زین العابدین صاحب بہادر۔ اور میر بادشاہ علی صاحب مع چند
دوسرے رفقا کے موجود تھے۔ جناب رشید ریل سے اُترے۔ نواب صاحب کے
صاحبزادہ نے استقبال کیا۔ اور اسٹیشن سے باہر فلس تک ساتھ ساتھ تشریف لاکے سوار کرادیا
جناب رشید فلس میں سوار ہوکر بارہ دری سالار جنگ بہادر واقع لکڑکوٹ
باغ میں پہنچے جہاں اُن کے لیے سامان آسائش فراہم کردیا گیا تھا۔ اسی بارہ دری میں

جناب نفیس مغفور بھی فروکش ہوتے تھے۔

جناب رشید فرماتے تھے کہ کھانا بہت نفیس آتا تھا۔ جس میں یہ چیزیں خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ اور جن کی لطافت طعم کا اکثر ذکر کرتے تھے۔

جگر = اہلی کی نئی کوپل اور قیمہ۔

تلی = وہی چاول (حیدرآباد میں برائے فاقہ شکنی محرم میں استعمال ہوتا ہے)

لوں بودی = نہایت لذیذ حلوہ میں مثل جوزی حلوا سوہن کے۔

دھی کلھا راملوا =

ماقلہ کی لور = میوے کی مٹھائی =

پہلی مرتبہ جناب رشید محرم میں تشریف لے گئے تھے۔ اور دوسرے سال سے چہلم کے زمانہ میں جایا کرتے تھے۔ اُن کے کمال نے پہلے ہی سال سے ادیا کہ نفیس کے بعد اگر کسی کو حیدرآباد میں مقبولیت عام ہو سکتی ہے تو رشید کو۔

نواب صاحب کی قدرشناسی

عالی جناب نواب بہادر الدولہ بہادر نے بھی قدر کمال کی اور اب دوسرے سال جو جناب رشید تشریف لے گئے تو جہاں نے لڑکوٹ باغ کے نواب صاحب کی خاص کوٹھی اقع نظام باغ میں قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رشید ہمیشہ نواب صاحب موصوف کی مدح سرائی میں مصروف رہتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میری عزت افزائی اور قدر سخن جیسی فرمائی ہے میں اُس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ واقعی انہوں نے اپنے احسانات کو رشید کی زندگی ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اُن کے بعد بھی اُن کے پسماندوں کے کفیل ہوئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

شرکائے مجلس وقت رشید

بقول رشید پہلی مجلس میں تقریباً سات ہزار آدمیوں کا اندازہ کیا گیا تھا

اور اُس کے بعد ہر مجلس میں پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے۔ یہ مجمع اگرچہ بادی النظر میں مبالغہ کی حد تک پہنچتا ہے۔ مگر حیدرآباد سے شعرا اور رشید سے ذاکر کے لیے چنداں زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ رشید کا رنگ سخن اپنے نانا انیس کے اتباع میں صاف اور عام فہم ہے۔ جائے تعجب نہیں اگر رشید کے کلام کو مرجعیت عام حاصل ہوئی + سر سالار جنگ بہادر مرحوم کا بنا کردہ ایک نہایت وسیع مکان ہے جو شادی خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ اُس میں مجالس ہوا کرتی تھیں کسی دوسری جگہ اتنا وسیع مجمع نہیں سکتا تھا علاوہ دیگر معززین شہر اور اراکین سلطنت کے سوا ذیل کی شرکت قابل ذکر و باعث وقار مجلس ہوئی عماد السلطنت نواب لائق علی خاں بہادر۔ منیر الملک نواب سخاوت علی خاں بہادر۔ نواب خانخاناں بہادر۔ نواب فخر الملک بہادر۔ مہاراجہ کشن پرشاد۔ شاد وزیر اعظم۔ نواب تہور جنگ بہادر۔ نواب محبوب یار جنگ بہادر۔ جناب مولوی افضل حسین صاحب چیف جسٹس۔

مجلس میں سوز و سلام | جناب مرزا محمد سعید صاحب ساوجی خلف جناب مرزا وزیر اعلی اللہ مقامہ

شرکت | جناب آغا علی خاں صاحب بہادر کے یہاں مجالس پڑھتے تھے۔ خانچہ ۱۳۲۳ھ میں حضور نظام مبرور مجلس میں تشریف لائے اور جناب سرور مغفور کو سُنا۔ بعد ختم مجلس فرمایا "کوئی اور مرثیہ خواں ہیں"۔ عاشر نشینا ہمسند شاہی نے دست بستہ عرض کی "ظل اللہ انیس مرحوم کے نواسہ جناب پیارے صاحب رشید بہرام الدولہ کے یہاں مجالس پڑھتے ہیں"۔ نواب بہرام الدولہ بہادر کو شرکت مجلس کے لیے عرض کرنے کا اتفاق سے ایک بیش بہا موقعہ مل گیا۔ اُنھوں نے حضور شاہی میں عرضداشت کی کہ جناب رشید میرے یہاں مجالس پڑھتے ہیں۔ شاہانہ عجب گر بنواز زگدا را۔ حکم ہوا کہ بابدولت رونق افروز مجلس ہونگے۔

بنا بریں دوسرے سال حضور نظام حسب وعدہ تشریف لائے اور مجلس حسینؑ کو زینت بخشی +

سال امامت
تو کت و دول

یہ اُس حسینؑ غریب کی مجلس عزا ہے جس میں شاہانِ اولوالعزم نے بارہا اپنی شان و شوکت و ظاہری کو تھوڑی دیر کے لیے طاق نسیان کی نذر کر دیا ہے۔ اُس کربلا کے مسافر کی مصیبت کو کوئی معمولی مصیبت نہ تھی۔ مگر اور بادشاہ دونوں کے جذبات الم اس واقعہ جاں گداز کے ذکر سے یکساں حرکت میں آتے ہیں۔ اور آخر کو منوا لیتے ہیں کہ اُس قبلۂ بنی ہاشم کے مجبور شہزادہ نے اپنے بشیرہ نذیر نانا کی اُمت کی مغفرت کے لیے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا نہایت خندہ پیشانی سے کیا کہ اُس کے عوض میں مذہب اسلام کے ذی وقار افراد اتنا بھی نہ کرتے کہ اپنی دُنیاوی نگاہ میں آداب امامت کا لحاظ رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے اظہار عزت و احترام کو ملتوی رکھتے اور رسول اللہ کو خوش کرتے +

حضور نظام
حاضر مجلس

حضور نظام کو اگرچہ مذہب شیعہ سے کوئی تعلق نہ تھا مگر جانتے تھے کہ یہ مجالس رسول اللہ کے نواسہ کا غم یاد دلانے کے لیے برپا کی جاتی ہیں۔ جن میں لحاظ ادب بھی ایک وقیع اجر رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور عالی جب فیاض علی خاں بہادر کے یہاں مجلس میں تشریف لائے تھے۔ تو مسند تکیہ بٹھوا دیا تھا۔ اور اُسی فرش پر تشریف فرما ہوئے تھے جس پر عوام بیٹھے تھے +

نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں بھی حضور عالی کے لیے مسند تکیہ نہیں بچھایا گیا +

حضور نظام ممبر سے کچھ فاصلہ پر دو زانو تشریف فرما ہوئے۔ زیادہ قابل مدح یہ امر ہے کہ باوجود ایسی شدید گرمی کے کہ پسینہ میں تر بتر ہو گئے تھے اپنے پنکھے کو کھڑا دیا اور دوسرے شرکاء مجلس کو برابر پنکھا جھلا گیا +

جناب رشید کو بھی اپنا کلام پیش کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

آداب شاہی بجالا کر منبر پر تشریف لے گئے اور یہ رباعیاں پڑھیں +

توصیف حیدرآباد	ماشاءاللہ ہے بہت خوب آباد حضرت کے قدم سے پائی ہے یہ صورت	خوش وضع آباد ہے خوش اسلوب آباد حیدرآباد اب ہے محبوب آباد	
	طالع جو بلندی پہ ہمارے آئے ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی	مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے خورشید کے ہمراہ ستارے آئے	

تیسرے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور عثمان علی خاں بالقابہ بھی بزمانہ ولیعہدی اپنے والد ماجد کے ہمراہ تشریف لائے تھے + اس رباعی کے بعد ایک سلام پڑھا۔ اور مرثیہ شروع کر دیا مگر یہ لحاظ رکھا کہ طول سخن حضور کی خاطر اتر کر پر بار نہ ہو۔ جا بجا عرض کرتے ہیں "حضور سنیں" مگر حضور فرماتے ہیں "اور پڑھیے" بشر سے معلوم ہوتا تھا کہ شہید کا کلام جادو کا اثر کر رہا ہے۔ اور کیوں نہ اثر کرتا حضور نظام خود روز مرہ کہتے تھے دوسرے نواب مرزا خاں داغ مغفور کے کلام کو خاص شوق سے دل عطا فرما چکے تھے۔ جو دہلی کے روزمرہ کی جان تھا۔ یہاں بھی مرثیہ کی یہی کیفیت تھی کہ گویا گلزار لکھنؤ کا ایک بلبل چہک رہا تھا نہ کہیں الفاظ ثقیل نہ کہیں مطالب دقیق۔ بندش سادہ الفاظ نرم و مناسب محل + یہی سب باتیں تھیں جو حضور نظام کی شاہانہ آواز کو داد سخن کے لیے بار بار بلند کرا دیتی تھیں۔ اور یہ میدان وہ تھا کہ کوئی کاکہنہ مشق و شیریں زبان پیر جھک جھک کر آداب بجالاتا تھا +

مرثیہ اپنی پوری روانی دکھا رہا تھا ذاکر کا دل ہاتھوں بڑھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ تقریباً دو گھنٹہ کی شرکت کے بعد حضور نظام رشید کو خلعت تحسین آخری دے کر دولت سرا تشریف لے گئے۔ اور اسی سال صرف ایک ہی مجلس میں شریک ہوئے۔ مگر دوسرے سال پانچ مجلسوں میں شرکت فرمائی۔ حضور نظام کی شرکت کی وجہ سے مجلس میں مجمع کی

کوئی انتہا نہ ہوتی تھی +

حضور نظام کا کلام رشید کو پڑھنے کے لئے عطا فرمانے کا ذکر

۱۳۲۶ و ۲۷ھ میں حضور نے کسی مجلس میں شرکت نہیں فرمائی ۱۳۲۸ھ میں چودہ مجلسوں میں تشریف لائے اپنی بہت سی رباعیاں اور چودہ سلام رشید کو مرحمت فرمائیں اور ارشاد ہوا کہ آپ ایک یا دو رباعیاں اور ایک سلام روزانہ پہلے ممبر پر پڑھیے اور اُس کے بعد مرثیہ شروع کیجیے۔ چنانچہ جناب رشید نے مطابق حکم عالی عمل کیا +

(مندرجہ رباعیاں اور سلام جناب رشید نے ایک مجلس میں پڑھے تھے کہ نقل کرائی گئیں)

پہلے روز جب جناب رشید کو رباعیاں اور سلام مرحمت ہوئے تھے تو اُنھوں نے پہلے اپنی یہ رباعی پڑھ کے اُس کے بعد حضور نظام کی رباعیاں اور سلام پڑھا تھا وہ یہ ہے

رباعی

رفعت کے پیام مجھ کو رفعت نے دیے
پیغام نام مجھ کو عزت نے دیے
کیوں ہو نہ رشید اپنی توقیر بڑھا
پڑھنے کو سلام مجھ کو حضرت نے دیے

ایک دوسری مجلس میں کلام فصاحت نظام کے پہلے رشید نے یہ رباعی پڑھی

رباعی

اعلیٰحضرت کو داد کیا دی جائے
یہ نظم اچھی نظم سے دیکھی جائے
قرآن حق کا۔ یہ ظل حق کا ہے کلام
بعد اُس کے تلاوت اس کی بھی کیجائے

کئی رباعیاں حضور نظام نے ستائش رشید میں نظم فرمائی تھیں۔ اور پڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہذا رشید نے جب اُن کو پڑھا۔ ہر ایک کے جواب میں ایک رباعی مدح نظام میں پڑھی لطف یہ ہے کہ رباعی میں رباعی کا جواب اور مدح نظام دونو چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) آمد

مداح امام دو جہاں ہیں یہ رشید
لاریب کہ اعجاز بیاں ہیں یہ رشید
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا
میں کیا کہوں واللہ جواں ہیں یہ رشید

(۱) رشید (جواب)	پیری میں جوان بن کے دیکھوں گا میں حضرت نے جواں کہا سنا تو نے فلک		اک جامہ نیا پہن کے دیکھوں گا میں ہر بار اب تجھ کو تن کے دیکھوں گا میں	

شاید دوسرا مصرعہ علاوہ دیگر محاسن کے خلعت کے حسنِ طلب میں ہے۔ اسی سال حضور نے خلعت مرحمت فرمایا تھا۔ ذیل کی رباعی بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

رشید	ہر اک اضطراب ادھر آتا ہے سلطان دکن سے مانگتا ہے خلعت		گرمی میں ماہتاب ادھر آتا ہے جاڑے میں آفتاب ادھر آتا ہے	
(۱) اصف	گو پیر ہیں پر طبع کی جودت دیکھو کہتے ہیں یہ آصف سے مضامین رشید		ہر شعر میں ہر بات میں جدت دیکھو پیری میں جوانی کی طبیعت دیکھو	
(۲) رشید	حضرت کی یہ اعجاز بیانی دیکھی آواز بجا لاتے ہی تھا رنگ کچھ اور		پیری کی نہ ذرہ بھی نشانی دیکھی جھک کر جو اٹھا میں تو بوای دیکھی	
(۳) اصف	کیا خوب سخن تم نے سنایا ہے رشید پیری میں یہ زور طبع ماشاء اللہ		مضموں کا اک راغ لگایا ہے رشید کیا رنگ جوانی کا دکھایا ہے رشید	

ممکن ہے کہ کسی مرثیہ کی بہار بہت پسند خاطر ہوئی ہو۔ اور اس کی داد میں یہ رباعی ارشاد فرمائی ہو۔

(۳) رشید	قابو میں کبھی نہ لا سکے گی مجھ کو اعلیحضرت نے سرفرازی بخشی		ڈھونڈھے گی مگر نہ پا سکے گی مجھ کو پیری اب کیا جھکا سکے گی مجھ کو	

اس رباعی کی روانی اور تیور دیکھنے کے قابل ہیں جن طبیعتوں میں ذوق سخن خداداد ہے وہ اس کے مزے خوب لیں گے

ذیل کا سلام حضور نظام کے ان سلاموں میں سے ہے جو رشید کو مرحمت ہوئے تھے۔

آصف	سلامی دیکھنا اشکوں کے گوہر ایسے ہوتے ہیں مضامین غم سرور و دل تھام کر سنیے		یہ ہیں شہ نے دامن میں مقدر ایسے ہوتے ہیں رگ جاں کھول دیتے ہیں یہ نشتر ایسے ہوتے ہیں	

سُنا شبیر کا نام اور اک بجلی گری دل پر
جو دل ہیں درد رکھتے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں

فرشتوں نے کہا جب سر کٹاتے آپ کو دیکھا
ولی اللہ کے اللہ اکبر ایسے ہوتے ہیں

ٹکڑے عباس کے لاشہ پہ یوں شبیر کہتے ہیں
برادر پر ہوئے قرباں برادر ایسے ہوتے ہیں

لڑے اس ڈھنگ سے اکبر کہ دشمن بھی پکار اٹھے
بہادر ان کو کہتے ہیں دلاور ایسے ہوتے ہیں

زمیں سے عرش پر پہنچا دیا شبیر نے حر کو
خدا کے خاص بندے بندہ پرور ایسے ہوتے ہیں

غضب کا معرکہ تھا معرکہ عشقِ حقیقی کا
کیا سر آپ نے سر دے کے سرور ایسے ہوتے ہیں

مرے آئینۂ دل میں ہے جلوہ ماہ زہرا کا
سکندر سے کہو دیکھے سکندر ایسے ہوتے ہیں

تن سرور پہ جتنے زخم تھے وہ سب بتاتے تھے
چھری تلوار برچھی تیر خنجر ایسے ہوتے ہیں

محبت زینب و شبیر کی دیکھو تو ظاہر ہو
کہ خواہر ایسی ہوتی ہے برادر ایسے ہوتے ہیں

لب و دندانِ شہ سے اور ہی کچھ بات پیدا ہے
نہ لعل اس رنگ کے دیکھے نہ گوہر ایسے ہوتے ہیں

لڑے بچے جو زینب کے تعجب اس پہ بیجا ہے
کہ جو شیروں میں پلتے ہیں وہ اکثر ایسے ہوتے ہیں

نہائے خون میں اصغر تو بانو نے کہا تن سے
کہ دیکھو باغِ جنت کے گلِ تر ایسے ہوتے ہیں

عدو بھی رہ گئے حیراں جو دیکھا صبر حضرت کا
یہ کیا معلوم تھا سبطِ پیمبر ایسے ہوتے ہیں

جو تڑپے خون میں اکبر تو زینب نے کہا رو کر
کہ دریائے شہادت کے شناور ایسے ہوتے ہیں

مظالم کربلا کے سن کے حیرت اس پہ ہوتی ہے
کہ یہ مٹی کے پتلے دل کے پتھر ایسے ہوتے ہیں

زمیں بولی فلک سے دیکھنا زہرا کے پیاروں کو
جو دن کو بھی چمکتے ہیں وہ اختر ایسے ہوتے ہیں

جو پوچھا تیغ قاتل نے کہ عاشق کیسے ہوتے ہیں
تو شہ بولے گلے اس کو لگا کر ایسے ہوتے ہیں

پھڑک کر شہ کی شہ رگ کہہ رہی تھی اپنے قاتل سے
کہ پیاسوں کے گلے مشتاق خنجر ایسے ہوتے ہیں

مزا کیا دے رہے ہیں دیدۂ تر اپنے آقا کے صدقے
یہ ہمنے آج جانا جامِ کوثر ایسے ہوتے ہیں

انعقاد مجلس مرید

اوپر ذکر کی ہوئی چودہ مجلسیں نواب بہرام الدولہ بہادر کی مقررہ دس مجلسوں کے علاوہ حضور نظام کے حکم سے قائم کی گئی تھیں۔ ان مجالس کے برپا ہونے کا خاص سبب ظاہر ہے وہ یہ کہ رشید کے کمال نے حضور نظام کے اشتیاق کلام کو روز بروز ترقی دینی شروع کی۔ جس قدر زیادہ سنتے گئے اسی قدر زیادہ محظوظ ہوتے گئے جب دس مجلسوں میں رشید کو سن کے سیری نہوئی تو نواب بہرام الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ پانچ مجلسیں اور کی جائیں۔ مابدولت شرکت کرینگے۔ چنانچہ تعمیل حکم کی گئی۔ پانچویں مجلس میں پھر ارشاد فرمایا کہ اور چند مجلسیں ہوں۔ مجلسیں ہونے لگیں اور رشید کے جوہر کھلنے لگے۔

جناب رشید کے یہ روز ایک مجلس بڑھتی گئی اور حضور نظام شرکت فرماتے رہے یہاں تک کہ جب تیرھویں مجلس کی نوبت پہنچی تو نواب بہرام الدولہ بہادر سے ارشاد ہوا "کہاں تک مجلسیں بڑھائی جائیں گی اب کل آخری مجلس ہے"

چودھویں مجلس میں حضور نظام جب تشریف لائے تو رشید کو اپنی ایک رباعی پڑھنے کو عنایت کی جو مضمون رخصت پر مشتمل ہے

آمد عشق شہ دیں کا یہ اثر پاتا ہوں — ہر روز جو میں جاتا ہوں اور آتا ہوں
منظور الٰہی ہے تو پھر آؤں گا — یا حافظ و ناصر میں کہے جاتا ہوں

جناب رشید کی برق مثال فکر نے بھی فوراً ذیل کی رباعی اسی ردیف و قافیہ میں موزوں کی اور اس کے بعد پڑھی +

رشید۔ پیری سے ضعف گو بہت پاتا ہوں — پھر فصل عزا آئے کہ پھر آتا ہوں
حافظ ہے وہ حضرت کو اسی سے لونگا — میں جس کی حفاظت میں دیئے جاتا ہوں

اب مجلسیں ختم ہوئیں اور جناب رشید علاوہ رقم مقررہ کے عطیہ خزانہ شاہی سے بھی بہرہ

ہوئے + تعجب ہوتا ہے کہ مابین حضور نظام و رشید تعلقات سخن گوئی اس حد تک پہنچ چکے تھے اور مراحم خسروانہ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی رشید کی قسمت نے کوتاہی کی۔ کہ نسلاً بعد نسلٍ کوئی انتظام فارغ البالی نہوا۔ ہاں۔ ایک سال قبل انتقال اعلیٰحضرت نے رشید سے فرمایا تھا "آپ کے لیے انشاءاللہ میں کچھ سامان کر دوں گا" مگر افسوس ہے کہ رشید کی قسمت نے یاوری نہ کی یعنی آنجہانی حضور نظام کی زندگی نے وفا نہ کی +

سنہ ۱۹۰۷ء | جناب رشید کو اُن کا کمال اور ضرورت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لیے لیے پھری۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں نواب نصیر الممالک مرزا شجاعت علی خاں بہادر عارف کے یہاں تشریف لے گیے۔ اول دو تین سال تک نواب صاحب موصوف اور جناب رشید سے سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ اسی اثناء میں حکیم صادق حسین صاحب خلف حکیم حیدر حسین صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو رہی۔ مگر رشید کی خودداری نے اُن کو اجازت نہ دی۔ مایحتاج سے کچھ زیادہ اُن کو حیدرآباد سے مل جاتا تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ ہوس مزید سے اپنے دامنِ کمال کو آلودہ کرتے۔ چونکہ جناب نواب صاحب خود وسیع النظر اور کمال شناس افراد میں سے ہیں۔ اس وجہ سے جب جناب رشید نے معمولی تحریک سے اُن کے یہاں جانے سے پہلو تہی کی تو نواب صاحب نے بھی یہ مرحلہ وقتِ ملاقات تک ملتوی رکھا۔ چنانچہ جب غالباً سنہ ۱۹۰۷ء میں اجلاس شیعہ کانفرنس کی شرکت کے لیے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ تشریف لائے تو جناب رشید سے ملنے گئے فرمایا "میں اب آپ سے زبانی وعدہ لیتا ہوں" رشید نے وعدہ کر لیا۔ اور اُسی سال سے ماہ ربیع الاول میں تشریف لے جانے لگے +

کلکتہ میں مجلسیں پہلی ربیع الاول سے شروع ہوتی تھیں۔ اور دس کو ختم ہوتی تھیں۔ جناب رشید آٹھ روز قیام فرماتے تھے۔ خواجہ عشرت نے لکھا ہے کہ عشرہ پڑھتے ہیں مگر نہیں۔ جناب رشید نے ایک مجلس پہلی سال جناب نواب صاحب کی کوٹھی میں پڑھی جو کلکتہ میں ہے اور سفارت خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ اُس کے بعد سے سفارت خانہ میں دو مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک مجلس امام باڑہ فردوس محل واقع مٹیا برج میں اور بس۔ جناب نواب صاحب رشید کو تین سو پچاس روپیہ مرحمت فرماتے تھے +

جناب رشید حالانکہ برابر حیدرآباد اور کلکتہ جاتے رہے۔ مگر یہ بات حیرت انگیز ہے کہ نہ تو اُنھوں نے خاص طور سے حیدرآباد کی سیر کی نہ کلکتہ کی۔ لوگوں نے اکثر کہا بھی مگر جواب دیا "میں ضعیف ہوا سیر و تفریح تو جوانوں کو زیبا ہے"

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کا بھی ایک واقعہ "آبِ حیات" میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو لکھنؤ کے ایک مرتبہ شناس نواب نے اُن کی تکلیف میں دیکھ کر معہ اہل و عیال اپنے مکان پر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا نشست کے کمرہ کی کھڑکیوں کا رُخ باغ کی طرف تھا۔ میر صاحب جب وہاں تشریف لے گئے تو کھڑکیاں بند پڑی تھیں اور اُسی طرح کئی برس اُن کی موجودگی میں بھی بند پڑی رہیں اُن کو کھول کر کبھی باغ کی طرف نہ دیکھا ایک دن کوئی دوست آئے اُنھوں نے کہا کہ اُدھر باغ ہے آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے۔ کیا اُدھر باغ بھی ہے۔ اُنھوں نے کہا۔ اسی لیے نواب صاحب آپ کو یہاں لائے تھے کہ آپ کا جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے سامنے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا "میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اُس باغ کی خبر ہی نہیں" +

مرزا غالب اور کلکتہ کے مطرب و مساطر

فطرتی مناظر کا حظ یورپ کے شعرا نے جیسا اُٹھایا ہے مشرقی حصوں کے شعرا نے ویسا نہیں اُٹھایا اور اگر اُس سے فائدہ اُٹھایا بھی تو ایسے ہی شعرا نے جن میں فطرت نے نظارے سے اثر لینے کی قوت پیدا کر دی تھی +

جس کلکتہ کی سیر رشید نے نہیں کی اُسی کلکتہ کو ہمارا ذکی الحس مست خیال شاعر غالب دہلی میں بیٹھا ہوا یوں یاد کرتا ہے +

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہاں کی مغربی طرز کی آبادی - جابجا یائیں باغ - ولائتی چکر اور اُس کی سرشام اغنوں سازی حسینانِ پارسی و فرنگ کی آزاد ہوا خوری - ان سب کے اثر سے غالب ایسا دل و نظر رکھنے والا کہاں تک بچتا + بالآخر کسی وقت کیف شراب میں گنگنا اُٹھا - کہ ؎

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حقیقت تو یہ ہے کہ مصرعۂ آخر کا تابع تمام قطعہ ہے - پرتگال اور فرانس سے چلی ہوئی پہلے مدراس پھر بمبئی - کلکتہ کے بندرگاہوں پر نکلتی ہے اور وہاں کے قدح نوشوں میں تازے دَور چلتے ہیں +

رشید کو اُس سے کیا علاقہ تھا - اُن کے دماغ کو تو میخانۂ جنت - ساقیِ نجف ساغرِ کوثر - حورانِ خوش منظر سب کے سب اپنی طرف اس قدر متوجہ رکھتے تھے کہ اگر ایک دفعہ

جنت شداد کا سماں بھی سامنے سے گذر جاتا تو اُن کا خیال نہ بہکتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نجف سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں +

مئے بخشش سے بھلا کب مجھے مایوسی ہے
جس سے ملتا ہے خدا تیری محبت ہے وہ شئے

نشہ بڑھتا ہے اُسی کا ہوں میں ہر دم ڈرے
مئے اُلفت کے تصور میں سراپا ہوں مئے

کب میں ناکام رہا روز مرا کام بنا
دل اگر بیٹھ گیا دُرد تہِ جام بنا

کلکتہ میں بھی جناب رشید کے احباب ایسے ہی کمال شناس اور وہی رتبہ تھے جیسے حیدرآباد وغیرہا میں۔ مگر اُن سبھوں میں جناب سید حسن صاحب شوستری رئیس کلکتہ کو جناب رشید سے بے حد حسنِ عقیدت تھا۔ جب جناب رشید کلکتہ پہنچتے تھے حتی الوسع سید صاحب موصوف سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرتے تھے +

ایک مرتبہ جناب رشید سید صاحب سے ملنے گئے۔ اثنائے گفتگو میں چائے اور لائچیوں کا ذکر آگیا۔ کسی صاحب نے کہا "بروک بونڈ" اچھی ہوتی ہے۔ کوئی بولا لپٹن کم خرچ بالانشیں ہے۔ غرضکہ حاضرین نے اپنی مختلف رایوں کا اظہار کیا۔ اب جناب رشید کی باری آئی تو فرمایا "جو زیادہ رنگیں ہو وہی عمدہ"۔ سید صاحب چونکہ حسنِ عقیدت رکھتے تھے سمجھے کہ رشید کو چائے اور لائچیاں مرغوب ہیں۔ لہذا جب رشید لکھنؤ واپس آئے تو چند دنوں کے بعد سید صاحب نے لائچیاں اور چائے تحفۃً رشید کو روانہ کیں۔ رشید نے تین باعیاں بطور شکریہ لکھ بھیجیں اور وہ یہ ہیں +

شکریہ چھوٹی

ناچیز کو بھیجا تھا جو تحفہ پہنچا
گردوں سے زمین پر من و سلوا پہنچا

بس اس کا عوض یہ ہے دعا دوں میں رشید
مجھ کو مرے دوست کا عطیہ پہنچا

الائچیوں کا شکر	جو دانہ ہے مشک کی طرح بے شک ہے ہر ایک الائچی ہے ایسا غنچہ	تخم الفت سمجھ لے گر زیرک ہے جس کی خوشبو دماغ سے دل تک ہے	
چائے کا شکر	آ لے پر شکر یہ کو تیار ہوں میں اس چائے میں کیف ہے مئے الفت کا	صد شکر میری جو ہے تو ناچار ہوں میں ساقی سید حسین میخوار ہوں میں	

پہلی اور تیسری رباعی بالکل صاف ہیں۔ مگر دوسری رباعی بہت خوب کہی ہے الائچی کے دانہ کا تخم الفت سے ایسا استعارہ کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ اور پھر زیرک بھی بہت خوب ہے۔

رشید کا سفر اور سلیم پور میں

جب جناب رشید نے لکھنؤ میں ترک مرثیہ خوانی کا اعلان کر دیا۔ تو ان کے کلام کے سچے دلدادہ شکستہ خاطر ہوئے۔ اور دعائیں مانگتے تھے کہ رشید کسی طرح پڑھیں اور وہ سنیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہر قسم کی کوشش جناب رشید کے لکھنؤ میں پڑھنے کے لیے ناکامیاب رہی۔ تو یہ عزم کیا کہ اگر رشید لکھنؤ کے اطراف میں بھی پڑھیں گے تو سنے جائیں گے چنانچہ ایک شخص میر کاظم حسین صاحب نے کوشش کی اور وعدہ لیا۔ کہ وہ ماہ صفر میں ایک مجلس کانپور میں پڑھیں۔ چنانچہ رشید حسب وعدہ ہر سال وہاں گئے۔ یہ مجلس بڑے امام باڑہ واقع محلہ پٹکا پور میں ہوتی تھی علاوہ اطراف کے مومنین کے لکھنؤ سے تقریباً دو ڈھائی سو آدمی جایا کرتے تھے۔ اور مجلس ایک بڑے مجمع سے ہوتی تھی +

جناب راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں بھی ایک مجلس اسی زمانہ میں پڑھتے تھے روز مجلس صبح کو راجہ صاحب کا موٹر آجاتا تھا رشید چلے جاتے تھے۔ اور بعد ختم مجلس واپس آتے تھے راجہ صاحب ایک معقول رقم دیتے تھے +

ایک مرتبہ ۱۹۱۸ء میں جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب ہادی ڈپٹی کمشنر پنشنر جناب رشید کی ملاقات کے لیے رکاب گنج تشریف لائے۔ سید صاحب موصوف نے

چند رباعیاں جناب رشید کو سنائیں۔ بہت خوش ہوئے تحسین کلام ان الفاظ میں فرمائی کہ آپ کا رنگ سخن بالکل نیا ہے۔ اور زبان بھی بہت خوب ہے۔ جناب سید صاحب جعفر منزل (قبہ رائے) میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جناب رشید بازدید کی غرض سے تشریف لائے جناب سید صاحب سے چاہا کہ وہ ایک مجلس لکھنؤ میں منعقد کریں اور جناب رشید رونق افروز ہوں۔ مگر چونکہ جناب رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا کم کر دیا تھا۔ اس لئے مجلس ہوئی جناب سید صاحب نے اپنے دولت خانہ پر (ملطان پور میں) ایک مجلس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور جناب رشید سے وعدہ لیا مگر یہ مجلس بوجہ علالت جناب سید صاحب عرصہ تک نہ ہو سکی اور جناب رشید راہی عدم ہوئے۔ بدر باعیات جو جناب ہادی صاحب نے جناب رشید مغفور کو سنائی تھیں از راہ کرم مجھ کو عنایت فرمائی ہیں۔ ذیل میں درج کرتا ہوں:

رباعیات

ہادی تو اور کسی خطا سے نہ ڈرے	حیرت ہے کہ نار سے نہ ڈرے
اس نازش حسن مرتضیٰ سے ڈر ہے	ایسا نہ ہو کہ بہر خدا سے نہ ڈرے
کیونکر کوئی اُنسی سے نہ ڈرے	مومن کیسا اگر علی سے نہ ڈرے
یہ دو لو خدا سے ہیں ڈرانے والے	جو ان سے ڈرے وہ پھر کسی سے نہ ڈرے
دنیا کی ہوس میں دین کی بربادی واہ	تو اور یہ راہ واہ رے ہادی واہ
روزے نماز کا ہے گا ہے	مولا کا غلام اور نہ آزادی واہ
سرمست ولا نبی کی صحبت والے	تھے رند کتنی بڑی محبت والے
بوذر مقداد ابن یاسر سلمان	اس نرم کے یہ چھپنے ہوئے متوالے

ہادی یہ نصیریوں کی طبیعت والے	تجھ رند اسی نشۂ الفت والے
لیکن اُن کا مذاق تھا غیر سلیم	اتنی پی لی کہ ہو گئے متوالے
موتی سے گئے وہ دانت بیہاتھ کہاں	اب لحجہ و لب میں وہ مزا ہاتھ کہاں
ہادی بنوا کے دانت کیا کام بنا	گو بات نکلتی ہے پہ وہ بات کہاں

تلامذۂ جناب رشید یوں تو جناب رشید کے شاگردوں کی اگر فہرست لکھی جائے تو طویل ہوگی مگر یہ چند حضرات قابل ذکر ہیں۔ نواب تراب علی خاں صاحب سعید۔ نواب خان خاماں بہادر۔ جناب سید باقر صاحب حمید۔ جدید سید عسکری مرزا صاحب مؤدب سجاد حسین صاحب شدید۔ مہدی حسن صاحب ناصری پروفیسر احمد حسین عرف منھو صاحب شفیق (صاحب دیوان) ابو صاحب علیس۔ حقیر مؤلف۔ نواب بڈھن صاحب قمر ہادی سید مہدی حسین صاحب مہدی۔ سید انور حسین صاحب انور۔ احمد خاں صاحب نظم منشی حامد حسین صاحب حامد +

واقعات آخر عمر جیسا اوپر بیان ہوا۔ رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی فن کے کرنے والے اپنی زندگی کے آخری کنارہ پر پہنچنے لگتے ہیں۔ تو زمانہ دوسرے افراد اُن کی قائم مقامی کے لیے تیار کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ رشید۔ عارف اوج۔ جاوید کے بعد مرثیہ گوئی کے قیام کے لیے چند نوخیز خاندانی مرثیہ گو میدان امتحان میں خم ٹھوک کر آکھڑے ہوئے اور بمعاد کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ۔ عوام نے بھی اُن کی طرف غیر معمولی دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ اور جانبداری میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا کہ پرانے نفوس گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر مرثیہ گوئی اُن کا ذریعہ معاش نہ ہوتا تو غالباً سب کے سب گوشہ گیر ہو گئے ہوتے۔ اور پھر کوئی اُن کی صورت نہ دیکھتا۔ کُنجِ عزلت و قناعت

کی ذات جن کو حاصل ہے وہ اُسے ایک نعمتِ عظیمہ سمجھتے ہیں۔ ہر وقت میں رشید اس نعمت سے متمتع ہوئے اور نہایت خوبی سے نباہا +

جناب رشید نے اپنے کلام میں بہری کو اس درد آوازیں دی تھیں کہ وہ اُن کے پاس عین وقت پر آپہنچی تھی۔ انھوں نے جواب دے چکے تھے۔ جب کوئی ملنے جاتا تھا تو فرماتے تھے "ہم گھٹ رہے ہیں اور ناتوانی بڑھ رہی ہے" جس لوگوں نے اُن کو قوی و تندرست دیکھا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے +

صورت یہ تھی کہ پچھتر برس کا سن۔ وہ کمر جس میں کبھی تلوار بندھتی تھی پیرانہ سالی سے جھکی ہوئی وہ آنکھیں جنھوں نے ایک عمر دُنیا کی مختلف نمائشوں کی سیر کی ضعفِ بصر کی شاکی وہ ہاتھ جنھوں نے زلفِ پریشانِ حسن آراستہ کی ضعف سے مرتعش۔ وہ سر جس کے مختلف گوشے کبھی شاعرانہ نازک خیالیوں سے مملو تھے معمولی مسافت سے بیکار۔ وہ زبان جو زبانِ انیس کی ترجمان تھی دُنیائے سخن کی ناگوار شورش سے خاموش۔ مگر رشید اب بھی وہی رشید تھے۔ اگر کوئی وقتِ آزمائش آپڑتا تو اُن کی قوتِ شاعرانہ اُسی طرح کام کرتی جیسے تیس برس قبل +

چنانچہ ایک مرتبہ مکان سے اپنے چھوٹے بھائی جناب کلن صاحب کے یہاں جا رہے تھے۔ مسافت سو قدم سے زیادہ نہ ہوگی کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اتفاق سے اُسی وقت کچھ حضرات ملنے آ رہے تھے اُنھوں نے جلدی سے اُٹھایا۔ رشید نے فوراً شکایتِ ضعف میں یہ شعر پڑھا ؎

ضعف نے اوج بڑھایا ہے مدِ اقبال کا
پاؤں کرتے ہیں ارادہ سری پامالی کا

اس واقعہ کے میرے روز سے ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اُٹھے +

وفات و دفن | اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ رشید بہت کمزور ہو گئے تھے اُن کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ موت کا سند بدا انتظار کر رہے ہیں۔ جو لینے جانا تھا اس سے ایسی مایوسانہ تقریر کرتے تھے کہ کچھ نیچے اثر سے کے اُٹھتا تھا۔ کہ یکایک شب پنجشنبہ چودہ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری کو تن لاغر پر فالج گر کے خبر دی کہ اب ادبی دُنیا پر رشید کا احسان ختم ہوتا ہے۔ زبان انیس خاموش ہوتی ہے۔ وہ وجود جو پرانے اوضاع و اطوار کا آخری نمونہ تھا۔ راہ فنا طے کر کے ملک بقا آباد کرنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے رشید کی خبر علالت تمام شہر میں مشتہر ہو گئی۔ اعزا و احباب اس وجود مغتنم کی عیادت کو جوق جوق آنے لگے + رشید بے حس و حرکت پڑے تھے اور لئے شکریہ کا زبان کو یارا نہ تھا۔ جو شخص سامنے آتا تھا سلام کو پہلے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ روز علالت سے چودہ دن تک اسی حالت میں رہے شہر کے ممتاز اطبا مثلاً جناب حکیم مُنے آغا صاحب فاضل۔ جناب حکیم سید مظفر حسین صاحب طبیب جناب حکیم سید [illegible] صاحب مرحوم جناب حکیم سید جعفر حسین صاحب وغیرہم یک رائے ہو کر مصروف تدبیر تھے لیکن موت کا کیا علاج۔ آخر کار چوہتر برس کی عمر کے بعد بروز جمعہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری وقت سحر اس دُنیا کے نمائشی مظہر کو خیرباد کہہ کے ملک بقا میں روحانی زندگی کی ابتدا کی۔ اعزا و احباب کو اپنی یاد کا غم دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

صبح کو ہزاروں آدمیوں سے میر عشق کی بغیہ بھری ہوئی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقہ کے لوگ شرکت تجہیز و تکفین کا آخری احسان رشید کی روح پر کرنے کو

بیٹھے تھے کہ نماز میت کے لیے صفیں مرتب ہوئیں۔ رشید کے محترم دوست جناب مولوی محمد حسین صاحب بسمل علامہ ہندی مرحوم نے نماز میت پڑھائی۔ چاروں طرف سے آواز بکا بلند تھی۔ لکھنؤ کی وہ مشت خاک جو خون شرافت اور جوہر کمال سے خمیر ہوئی تھی میر زیر زمین نہاں ہونے والی تھی۔ اعزا الگ گریاں تھے احباب الگ خروشاں۔ علما الگ آبدیدہ۔ چنانچہ افقہ زماں مولانا سید باقر صاحب قبلہ مجتہد العصر نے جناب حمید مرحوم سے درد آمیز لہجہ میں فرمایا: "آج ہم میں سے ایک صاحب کمال اٹھ گیا"۔ ان کے علاوہ اور دوسرے مجتہدین اولوالعزم مثلاً شمس العلما جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ۔ شمس العلما جناب مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ۔ زبدۃ العلما جناب سید آقا حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا سید محمد رضا صاحب قبلہ مرحوم اعزا کو تلقین صبر فرما رہے تھے۔

چونکہ امام باڑہ کے اس حجرہ میں جہاں تعشق و صابر وغیرہم مدفون ہیں بالکل جگہ نہ تھی۔ اس لیے اس دالان میں جو زیر مسجد ہے مدفون ہوئے۔ جمعہ کو مجلس فاتحہ خوانی ہوئی۔ اور بائیس ذی الحجہ بروز یکشنبہ امام باڑہ جناب سید تقی صاحب اعلی اللہ مقامہ میں مجلس حلیم ہوئی۔ اور متعدد قطعات تاریخ پڑھے گئے۔ جن میں سے اختصاراً چند درج کیے جاتے ہیں۔

منظومہ مداح آل محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی	
ہزار حیف جہاں سے اٹھے جناب رشید	ریاض مدح میں اک حشر ہو گیا برپا

زبان اہلِ سخن پر یہ نوحۂ غم ہے
انیس کا دمِ نغمہ کمال فن پر تھا

گئے عدم کو جو وہ زیبِ بزمِ مجلس
جناب میر یا ہی جگہ نہ ہو سید الشہدا

نکاتِ نظم پہ وہ قادر طبیعت نظری
زباں سے شعر جو نکلا وہ دل میں اتر گیا

رباعیات میں برق یوں کہتے تھے
جو ان کے لیے اندوہ غم کہتے گویا

بہارِ مرثیوں کی وہ بہارِ گلشن تھی
کہ جس پہ بلبلِ سدرہ بھی والہ و شیدا

زباں وہ صاف کہ مانندِ جوئے کوثر
مزا تھا بزم میں جس سے علی کی جرأت کا

سنوارتے تھے جو مرثیہ تو ہزار وہ
خود آتی قدرتِ تخیل بن کے آئینہ

دکھائی بزم میں جب قدرتِ بلاغت
دل عدو بھی تھا حسنِ قبول کا شیدا

رشید وہ تھے ایسا کہ اہلِ علم نے مانا
کلام حق کا سند اہلِ علم نے مانا

مریض ہو گئے اور دفعتاً بڑھا یہ مرض
محال ہو گیا بارِ حیات کا اٹھنا

محال ضعف سے طالع کے کوکبِ جنبش تھی
مگر گئے سوئے اعدا جبکہ آئی قضا

سحر کا وقت تھا ذیقعدہ کی تھی بیس تاریخ
کہ آفتابِ کمالات زیرِ خاک چھپا

لحد بنی بڑے احباب واسطے کے لیے
ہر ایک آنکھ سے جاری تھا اشکوں کا دریا

وہیں یہ قبر تھی جس جگہ یہ سوتے تھے
بس ایک ہی تھا حیات و وفات کا نقشا

شمیم قبر کے پھولوں کی دیتی تھی خبر
وہ پہنچا مدح سرا سوئے جنت الماوا

سنِ وفات یہ شعر سے کہہ اٹھا رضواں
ہر ایک بیت پہ اک پاک گھر ارم میں ملا

۱۳۰۶ھ

منظومۂ جناب سید ظہور حسین صاحب فروغ سیتاپوری

جانگزا ماتم پہ درد و رشید بکیت
۱۹۱۸ء

رفت زیں دار فنا کامل و اعجاز بیاں
۱۳۲۶ھ

وائے روداد چنیں واقعۂ صعب فروغ
۱۹۰۸ء

واقفِ فن سخن حیف نماندہ بجہاں
۱۳۲۶ھ

دوسرا سانحہ جانگداز اسمال حمید۔

جناب رشید مرحوم کے بعد اس خاندان میں لوگوں کی نظریں اُن کے بھائی جناب میر باقر مرزا صاحب حمید پڑنے لگیں یہ مرحوم بھی نہایت کہنہ مشق اور خوش گو تھے۔ دیانے مرثیہ گوئی میں لوگ ان کو بھی نظر تحسین سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً بعد وفات جناب رشید۔ مگر افسوس ہے کہ عالم پیری آپہنچا تھا ۱۴ ماہ صفر ۱۳۳۹ھ کو جناب حمید نے بھی بعارضہ تپ وبائی مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ جناب حمید میں وہی پرانی وضع کے جوہر پائے جاتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ گفتگو نہایت نرم اور شیریں۔ اعزا و احباب سے ہمدردی کرتے تھے۔

اسی سال جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے انھیں حیدرآباد طلب فرمایا تھا۔ اور جناب رشید جن تاریخوں میں مجلسیں پڑھتے تھے اُن میں پڑھوایا تھا مشہور ہے کہ حمید مرحوم نے بھی جناب رشید کی طرح مقبولیت حاصل کی تھی۔ بعد ختم مجالس وہیں تپ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں لکھنؤ واپس آئے اور چند روز کے بعد انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب رشید کے نواسے جناب میر سجاد حسین صاحب رشید بحمد اللہ موجود ہیں۔ جن سے اُن مرحوم کا نام روشن ہو سکتا ہے۔

یونانی دواخانہ

حضرات یہ دواخانہ تیس سال سے بیماروں کی خدمت کامیابی کیساتھ بجا لا رہا ہے بعضی جدا
ہر قسم کی مفرد و مرکب دوا یہ نہایت اہتمام کے ساتھ بہم پہونچائی جاتی ہیں تاکہ خریداروں کو کوئی شکایت
کا موقع نہو آج تک جو صاحب بھی اس دواخانہ کے خریدار ہیں انکو دوسرے دواخانہ میں جانے کی ضرورت نہ پڑی
دواؤں نے خاطر خواہ اثر کیا حکیم نبا صاحب کے کل مجربات تیار رہتے ہیں اور انکی قیمت اتنی کم ہے
کہ ہر امیر و غریب انکا استعمال کر سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے نسخے یہاں تیاری کیلئے دیے
جاتے ہیں انکا انتظام مالک دواخانہ اپنی نگرانی میں کرتے ہیں تاکہ خریدار اطمینان ہو عرق اور
شربت میں اس کارخانہ کو خاص امتیاز ہے۔ اگر دس قسم کے شربت ایک شیشی میں رکھ دیے
جائیں تو دونوں شربتوں میں دیکھنے والے کو اختلاف ہو جائے۔ یہ خصوصیت دوسرے دواخانوں کو میسر
نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کے دواخانے بہت کھلے اور ٹوٹ گئے مگر بحمد اللہ یہ دواخانہ اپنی پہلی سی
آب و تاب کے ساتھ قائم ہے تمام حکماء اپنے اپنے خاص خاص نسخے خصوصیت کے ساتھ یہاں بھیجتے ہیں
تاکہ انھیں اپنے علاج کے اثرات کا کافی اندازہ ہو۔ دوا کی برائی کا شک دل میں پیدا نہ ہو
اگر کسی صاحب کو اس قسم کی ضرورت ہو تو وہ سرور اس کارخانہ کی آزمائش کر لیں
انشاء اللہ انکو کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

نوٹ۔ فرمائش پتہ صاف اور خوشخط لکھیے اور چوتھائی قیمت پیشگی روانہ فرمائیے۔

سردار حسین منیجر دواخانہ یونانی پل فرنگی محل لکھنؤ

[illegible] نامی [illegible] تازہ [illegible]

[illegible] دوائی [illegible] ملاحظہ کرنا [illegible]
[illegible] معدن الادویہ [illegible] الاحباب [illegible] الحکیم [illegible]
[illegible] ہے [illegible] خود سے لکھ کر [illegible] فائدہ اٹھا [illegible]
اس دواخانہ [illegible] دوائی [illegible] ادویات [illegible] دواساز [illegible] دیا ہے اور [illegible]
[illegible] اس [illegible] تیار کرنا [illegible] اعلیٰ [illegible] اور الوجود
[illegible] ہیں [illegible] اور [illegible] الاکار [illegible] ادویہ [illegible]
[illegible] دوائی [illegible] ہوگئے [illegible] ہیں [illegible] امراض [illegible] گئے [illegible] دوائی
[illegible] امراض [illegible] علاج [illegible] حاصل [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] دوائیں [illegible] ادویات [illegible] ہیں [illegible] دواخانہ [illegible]
[illegible] کر سکتے ہیں۔

طبی مشورہ مفت

دواخانہ [illegible] طبی مشورہ مفت [illegible] کتاب [illegible] الاحباب [illegible]
[illegible] میں [illegible] ہیں [illegible] زیادہ احتیاط [illegible]
[illegible] ٹکٹ ضرور آنا چاہیئے۔

(فہرست دواخانہ مفت طلب فرمائیے)

المشتہر

منیجر دواخانہ معدن الادویہ وکٹوریہ اسٹریٹ (لکھنؤ)